ماہر القادری

کی 'بے استادی' پر

راجا رشید محمود کی 'استادانہ' گرفت

ناشر

انجمن حزب الرحمٰن بصیر پور ضلع اوکاڑا

نام کتاب: ماہر القادری کی ''بے استادی'' پر راجا رشید محمود کی ''استادانہ'' گرفت

ترتیب: (صاحب زادہ) محمد فیض المصطفیٰ نوری

صفحات: ۴۸

سنہ اشاعت: دسمبر ۲۰۰۶ء

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

ناشر: انجمن حزب الرحمٰن بصیر پور ضلع اوکاڑا

پیش لفظ

راجا رشید محمود مسلم الثبوت شاعر، نامور محقق، صاحبِ طرز انشا پرداز، مستند مؤرخ اور بے لاگ نقاد ہیں--- لیکن ان کی اصل شناخت نعت گوئی سے ہے، انھوں نے خود کو نعت اور فروغِ نعت کے لیے وقف کر رکھا ہے--- وہ بلاشبہ نعت گویانِ عصر کے سرخیل ہیں اور علمی و ادبی حلقوں میں ''شاعرِ نعت'' کے لقب سے پہچانے جاتے ہیں---

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موصوف نے دنیائے اسلام میں نعت کے موضوع پر سب سے زیادہ کام کیا ہے، کہ وہ چالیس سے زائد مجموعہ ہائے نعت کے شاعر، نعت پر ۹ تحقیقی کتب کے محقق، ۱۰ انتخاباتِ نعت کے مؤلف اور تدوینِ نعت پر ۱۵ کاوشوں کے مرتب ہیں---

ان کی زیرِ ادارت ۱۹۸۸ء سے تا حال ماہ نامہ ''نعت'' باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے، جس کا ہر شمارہ نعت کے موضوع پر خاص شمارہ ہوتا ہے---

راجا صاحب جہاں خود اعلیٰ پائے کے نعت گو ہیں، وہیں وہ نعت گو شعراء کے قدردان بھی ہیں--- ۱۹۷۷ء میں عظیم نعت گو شاعر علامہ ضیاء القادری بدایونی رحمہ اللہ پر انھوں نے ایک مقالہ تحریر کیا، جسے احقر نے بطور نائب مدیر، ماہ نامہ نور الحبیب بصیر پور، ستمبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع کیا--- اس مقالہ میں موصوف نے علامہ ضیاء القادری کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے شاگردوں میں ماہر القادری کا نام بھی لکھ دیا، جو مبنی بر حقیقت تھا، مگر ماہر القادری اس پر پیچ پا ہو گئے اور انھوں نے اپنی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ماہ نامہ ''فاران'' کراچی، اکتوبر ۱۹۷۷ء میں اس مقالہ پر تبصرہ کر دیا، جسے ان کی خواہش پر من وعن ''نور الحبیب'' نومبر ۱۹۷۷ء میں شائع کر دیا گیا--- راجا صاحب نے

اس تبصرہ کا نہایت مدلل جواب تحریر کیا، جو ماہ نامہ نورالحبیب جنوری ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا---
ماہر القادری کا اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس جوابی مقالہ کو اپنے پرچے میں شائع کرتے تاکہ قارئین فاران حقائق آشنا ہوتے، مگر وہ وسعتِ ظرفی سے کام نہ لے سکے--- انھوں نے حسبِ عادت خطوط میں الجھانا چاہا اور میری معرفت راجا صاحب کو جوابی خط تحریر کیا--- راجا صاحب نے اس کا تحقیقی جواب تحریر کر کے ماہ نامہ نورالحبیب میں شائع کرادیا، مگر اس پر وہ کوئی جواب نہ لکھ سکے---

اس معرکہ آرائی کے حوالے سے معروف شاعر جناب احمد ندیم قاسمی نے روزنامہ امروز، لاہور میں اپنے کالم "حرف و حکایت" میں (جسے وہ عنقا کے قلمی نام سے لکھتے تھے) دو کالم تحریر کیے اور راجا صاحب کے جواب سے خوب حظ اٹھایا---

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی دانش ور اور محقق کی علمی و تحقیقی تحریریں پوری قوم کا سرمایہ ہوتی ہیں--- اس لیے محترم محمد فیض المصطفیٰ نوری نے اس قلمی معرکہ آرائی کو مرتب کردیا ہے--- اس طرح تین مشہور اہل قلم--- ماہر القادری، راجا رشید محمود اور احمد ندیم قاسمی--- کی تحریریں محفوظ ہوگئی ہیں---

ان مضامین کی ترتیب کچھ یوں ہے:

امید کہ اہل علم و دانش اسے مفید پائیں گے اور اس سے محظوظ ہوں گے---

بصیر پور شریف — (صاحبزادہ) محمد محب اللہ نوری
ضلع اوکاڑہ — مدیر اعلیٰ ماہنامہ نورالحبیب

عظیم نعت گو شاعر

علامہ ضیاء القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

راجا رشید محمود

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است، نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قلم را

حضور سرورِ کائنات، فخرِ موجودات ﷺ کی تعریف و ثنا کے متعلق عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ نعت گوئی تمام اصنافِ سخن سے زیادہ مشکل ہے اور کوئی راہ اس سے زیادہ دشوار گزار نہیں۔ حضور نورِ مجسم، رحمتِ عالم ﷺ کی ذاتِ اقدس و اطہر سے عشق و محبت ایمان کا بنیادی جز ہے مگر محبت و ارادت کے ان جذبات کے اظہار کا یہ میدان بے حد عظیم اور وسیع ہے۔ اس میں ذاتِ ممدوح کی عظمت و شوکت کا احساس بھی عناں گیر ہوتا ہے، اس بارگاہِ بے کس پناہ کے آداب کا لحاظ بھی ہوتا ہے، جہاں اپنی آوازوں کو اونچا نہ کرنے کی الوہی ہدایت ہے، انسان کی کم علمی اور بے مائیگی بھی سدِ راہ ہوتی ہے کیوں کہ احمد مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی تعریف میں خود خدائے عزوجل رطب اللسان ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است

نعت کہنے میں ایک اور بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ کہیں ارادت و عقیدت کے بہاؤ میں مداح

افراط کا شکار نہ ہو جائے کیوں کہ نعت کی وسعت کی حدیں معبودِ حقیقی سے جا ملتی ہیں اور اس امر کا احساس و ادراک لازمی ہے کہ فکر و تخیل کی ذرا سی لغزش نعت کے بجائے حمد کی سرحد میں لے جا سکتی ہے۔ اسی طرح شاعر کو اس منزل سے گزرتے ہوئے اس کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی ترکیب، کوئی اصطلاح، کوئی تشبیہ، کوئی استعارہ، مالک و مختار ﷺ کے علو مرتبت سے فروتر نہ ہو اور شعر میں محبوبِ مجازی کی تعریف کا عالم پیدا نہ ہو سکے۔ یعنی افراط کی طرح تفریط سے بھی پہلو بچانا پڑتا ہے۔ نعت گو کے لیے ضروری ہے کہ معبود اور محبوب کے نازک فرق کو بھی پیش نظر رکھے اور 'عبد' اور 'عبدہٗ' میں بُعد کو بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے:

عبد دیگر ، عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار ، او منتظر

چناں چہ علمِ دین سے بیگانہ شخص کے لیے نعت گوئی واقعی بے حد مشکل کام ہے۔ جس شخص کو الوہیت کی حدوں، رسالت کی عظمت اور اپنی کم مائیگی کا شدید احساس نہ ہو اور خدا اور رسولِ خدا (ﷻ و ﷺ) کے احکام اس کے دل و دماغ پر مرتسم نہ ہوں، اس کے لیے اس راہ سے بخیریت گزرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ یوں علمائے کرام ہی حقیقی معنوں میں نعت کہنے کے فرض سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے اہم شخصیتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہیں۔ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق، حضرت سیدنا علی المرتضیٰ، حضرت سیدنا عبداللہ بن رواحہ اور دیگر کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نعتیہ اشعار منقول ہیں، مگر حضرت کعب بن زہیر اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نعتیہ قصیدے بے حد مقبول ہیں۔ ان نعتوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ حضرت ممدوح کے حضور پڑھی گئیں اور حضور نبی کریم ﷺ نے انھیں پسند فرمایا۔ مثلاً حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ شعر:

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَأَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

"آپ کو تمام عیوب سے پاک پیدا کیا گیا، تحقیق آپ کو اس طرح پیدا کیا گیا، جس طرح آپ نے چاہا"---

غیر صحابی شعراء میں حضرت علامہ بوصیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قصیدہ بردہ زبان زدِ خاص و عام ہے۔ حضرت سیدنا محی الدین جیلانی غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ، خاندانِ رسول کریم کے خدام سے اپنی نسبت کو اپنے لیے باعثِ فخر و مباہات گردانتے ہیں:

کمینہ خادمِ خدامِ خاندانِ تو ام
ز خادمیٔ تو دائم بود مباہاتم

حضرت فریدالدین عطار، مولانا جلال الدین رومی، مولانا عبدالرحمٰن جامی، مولانا قدسی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور علامہ فضلِ حق خیرآبادی (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے عربی و فارسی میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے حضور ہدیۂ عقیدت و ارادت پیش کیا، جس پر اہلِ عشق و محبت آج بھی سر دھنتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ، خواجہ معین الدین چشتی، ابنِ عربی، بوعلی قلندر پانی پتی، امیر خسرو، خواجہ گیسو دراز (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا نعتیہ کلام سرکار ﷺ کے نام لیوا اب بھی وردِ زبان رکھتے ہیں۔

اردو میں مولانا کفایت علی کافی کی نعتوں میں سوز کی کیفیتوں کی جاذبیت ہے۔ اس زبان میں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ منارۂ نور ہے۔ 'حدائقِ بخشش' میں رضا بریلوی نے محاسنِ شعری کے گل بوٹوں پر عقیدت کے جو رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں، وہ صرف انھی کا حصہ ہے۔

مولانا بریلوی کے بعد جس شاعر نے نعت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھا اور سرکار ﷺ کی مدح گوئی کو یوں شعار کیا کہ ان کے بغیر نعت کی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی، وہ مولانا یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی تھے۔ برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے شعرا نے علامہ ضیاء القادری سے اکتسابِ فیض کیا۔ شکیل بدایونی، ماہر القادری، تابش قصوری، محشر بدایونی، اختر الحامدی، نسیم بستوی، سحر اکبرآبادی اور طالب انصاری ان کے ممتاز شاگرد ہیں۔

ضیاء القادری نے ہزارہا نعتیں کہیں، سیکڑوں طویل اور مختصر نظمیں لکھیں، سیکڑوں مناقب پیش کیں۔ ان کا بیشتر کلام سالہا سال تک ان کے اپنے نام کے بجائے 'شاعرِ آستانہ' کے نام سے بھی آستانہ دہلی میں چھپتا رہا۔ مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی نے موصوف کے نعتیہ مجموعہ 'تجلیاتِ نعت' کے دیباچہ میں لکھا:

"جب خدا نے دیکھا کہ لامذہبیت کا طوفان اٹھ رہا ہے، بے دینی کا تسلط دلوں پر ہوتا جا رہا ہے تو اس نے ایک ایسا شاعر پیدا کر دیا جو اس بے دینی اور لامذہبیت کے دور میں خدا اور رسول (ﷻ و ﷺ) کا پیغام دنیا کو پہنچائے اور خدا نے اس شاعر کے کلام میں ایسا درد دیا ہے کہ پتھر سے پتھر دل رکھنے والا بھی اس شاعر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ شاعر کون ہے؟ ان کا نام ضیاء القادری ہے"---

رہبرِ شریعت اور مشہور شاعر انصار الٰہ آبادی، علامہ ضیاء القادری کی کتاب مناقب 'ستارۂ چشت'

کی تقریظ میں لکھتے ہیں:

''علامہ ضیاء القادری تمام اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ قصیدہ، حمد، نعت، منقبت، سلام، رباعی، تاریخ، غزل وغیرہ میں عجیب عجیب قیامت خیز کمالات دکھاتے ہیں اور ہر شعر میں بندشیں چست، زبان سلیس، جذباتِ مقدسہ کا بے پناہ سیلاب، الفاظ ترشے ہوئے نگینے، کہیں شبِ اسریٰ کی ارتقائی منازل، کہیں کوثر کے مشک بو چھینٹے، کہیں شبِ ہجرت کا سہانا عکس، کہیں کالی کملی میں برقِ ایمن کی شعاعیں، کہیں نغمۂ 'لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ' کی گونج، کہیں گنجینۂ معنی، کہیں اسرارِ معرفت، غرض ہر شعر ایمانی جذبات و محسوسات کا ایسا رنگین اور جامع مرقع و نمونہ ہے، جس کی کما حقہ مدح کے لیے الفاظ نامساعد ہیں۔ 'شاعری جزویست از پیغمبری' ایسے ہی نعت گو حضرات کا ازلی حق ہے۔ یوں تو ہر شاعر بزعم خود نعت گوئی کا دعوے دار ہے لیکن 'ایں سعادت بزور بازو نیست' ''---

'مرقعِ یادگارِ شہادت' حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعات پر مشتمل ضیاء القادری کی ایک طویل نظم ہے، جس میں انھوں نے حادثۂ کرب و بلا کو نہایت حزم و احتیاط اور ادب و احترام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظم کتابی سائز کے ۲۴۰ رصفحات میں ہے۔ اس کتاب کی تقریظ کے طور پر مولانا عبد الحامد بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے علامہ کی شخصیت کے بارے میں یوں اشارات کیے ہیں:

''علماء و مشائخ اور اربابِ علم و ادب یکساں طور پر ان کی نظموں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مولانا ضیاء القادری محض ایک کامیاب شاعر ہی نہیں بلکہ علم و ادب اور فنِ تاریخ میں بھی خاص درک اور مہارت رکھتے ہیں'' ---

شاعرِ اہلِ سنت ۲ رجون ۱۸۸۳ء (۲۲ ررجب ۱۳۰۰ھ) کو بدایوں میں پیدا ہوئے، چار سال کی عمر میں والدین کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا، اس لیے تربیت کا انتظام غالب و مومن کے شاگرد اسیر بدایونی نے کیا۔ انھوں نے قرآن مجید پڑھا، فقہ و تفسیر اور احادیث کی کتابیں پڑھیں، چودہ سال کی عمر میں آپ نے عالمانہ استعداد حاصل کرلی۔ دس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور زندگی بھر اسے اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ مولانا عبد الحکیم شرف قادری اپنی تصنیف لطیف 'تذکرۂ اکابرِ اہلِ سنت' میں لکھتے ہیں:

''مولانا ضیاء القادری نہایت خلیق اور سراپا درد بزرگ تھے۔ ایثار و خلوص کی جیتی جاگتی تصویر تھے، انکسار پسند اور شگفتہ مزاج تھے، ظاہری شان و شوکت سے آپ کو کوئی

لگاؤ نہ تھا، تقویٰ و پرہیزگاری میں سلف کا بہترین نمونہ تھے'' ---

۱۹۴۸ء میں آپ کو زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل ہوئی اور آپ کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ پاکستان کے سب سے پہلے حاجی تھے۔ ۱۵ راگست ۱۹۷۰ء (۱۲ رجمادی الاخریٰ ۱۳۹۰ھ) کو آپ کا وصال ہوا۔ مزار، فیڈرل ایریا کراچی میں ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جب تک کوئی شخص قرآن و سنت کی روح کو نہ سمجھتا ہو، مقامِ محبوبیت کو پہچاننے کی صلاحیت سے بہرہ مند نہ ہو نعت کہنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ ایک فرد جو بنیادی طور پر طبعِ رسا بھی رکھتا ہو، سرکار ﷺ سے محبت اور عشق اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہو، وہ علمِ دین میں ادراک کامل بھی رکھتا ہو، صرف وہی اللہ تعالیٰ کی اس سنت پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہے اور علامہ ضیاء القادری، اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضور (ﷺ) کے کرم سے ان صفات سے پوری طرح متصف تھے۔ ان کے روحانی پیشوا احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ نے کہا تھا:

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ!

ضیاء القادری نے پوری طرح اس روش کو اپنایا اور قرآن و حدیث کو اپنے افکار کی اساس ٹھہرایا۔ جہاں انھوں نے حضور پرنور ﷺ کی بشریت کا ذکر کرکے ابنِ آدم کو اس کا مقام یاد دلایا کہ:

جب آپ نے 'اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ' کہا
انساں کو احترام کے قابل بنا دیا

وہاں حبیبِ کبریا ﷺ کے بے مثل ہونے کے متعلق حدیثِ پاک کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

مخاطب ہے جہاں، وردِ زباں ہے 'اَیُّکُمْ مِثْلِیْ'
وجودِ پاک ہے بے مثل و بے ہمتا محمد ﷺ کا

حضور ﷺ کا ارشاد ہے 'جس نے مجھے دیکھا اس نے خداوند کریم کو دیکھ لیا'۔ ضیاء القادری کہتے ہیں:

اگر کشفِ رموزِ 'مَنْ رَاٰنِیْ' کی تمنا ہے
نظر رکھے خدا پر دیکھنے والا محمد ﷺ کا

اسی نعت کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ کملی اوڑھ کر بھی چودھویں کے چاند کہلائے
لقب قرآں میں ہے 'مُزَّمِّل و طٰہٰ' محمد ﷺ کا

'فَـــوَلِّ وَجْهَکَ' فوراً ہی فرمایا محبت سے
خدا نے دیکھ کر رخِ جانبِ کعبہ محمد ﷺ کا

کھلا یہ راز آیاتِ 'فَتَـــرْضٰـــی' کی تلاوت سے
وہ ہے اللہ کی مرضی، جو ہے منشا محمد ﷺ کا

علوئے منزلت 'وَ الــلّٰــہُ اَعْــلَــمُ' اور کیا ہوگی؟
ہے خلوت گاہِ 'اَوْ اَدْنٰـــی' مقامِ اوجِ محمد ﷺ کا

سرکار ﷺ پر نبوت کی تکمیل ہو گئی، ابد تک حضور ﷺ ہی کی شریعت انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضامن ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ ہمارے شاعر اس حقیقت کو قرآن کے حوالے سے کتنی سلاست سے بیان کرتے ہیں:

علم بردارِ 'اَتْــمَــمْــتُ عَلَـیْـکُمْ نِعْمَتِیْ' تو ہے
اڑے گا تا ابد پرچم ترے دینِ مکمل کا

محبوبِ خدا ﷺ خالق و مالک کے مظہرِ اتم ہیں تو ان کی مثال اور نظیر کس طرح ممکن ہے:

مظہرِ 'لَیْـــسَ کَـمِـثْـلِـــہٖ' ہے تری شانِ جمال
تو وہ یکتا ہے، کوئی تیرا مماثل نہ ہوا

خداوند قدوس نے اپنے پیارے رسول ﷺ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا۔ دیکھیے، اس سے شاعر بے نواؤں کو کیا مژدہ سناتے ہیں:

'یَــدُ الــلّٰــہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ' کے معنی ہم تو یہ سمجھے
ہے دستِ بے نوا دستِ حسینِ عرش مسکن میں

قرآن پاک کی زبان میں معراج النبی ﷺ کا حوالہ سنیے:

شبِ اسریٰ تمھاری شان 'سُبْــحٰــنَ الَّــذِیْ اَسْـرٰی'
شہنشاہِ سریر آرائے 'فَـــوْسَیْـــنِ وَدْنٰـــی' تم ہو

جب خود خدا اپنے محبوب کے ذکر کو بلند کرنے کا اعلان کرے تو حضور ﷺ کی رفعتِ شان کا ادراک کس طرح ممکن ہے:

کہتا ہے خدا بھی 'وَ رَفَعْــنَـا لَکَ ذِکْــرَکَ'
ہو کس سے بیاں رفعتِ سلطانِ مدینہ ﷺ

خدا و مصطفیٰ (ﷻ و ﷺ) کے راز و نیاز کے خاص وقت کے بارے میں ضیاء القادری

حدیث پاک کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں:

مقامِ 'لِیْ مَعَ الــلّٰــہِ' ہے، خدائی۔ بے خبر جس سے
جدا حدِ خرد سے، حدِ استغراقِ احمد ﷺ ہے

علامہ ضیاء القادری علیہ الرحمہ کے دو ضخیم نعتیہ دیوان میرے پاس ہیں 'خزینۂ بہشت' اور 'تجلیاتِ نعت'۔ ان کے علاوہ بے شمار جرائد میں ان کا نعتیہ کلام موجود ہے، ابھی بہت سا کلام طباعت کے مراحل سے نہیں گزر سکا۔ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کے ان دفاتر میں ہزاروں جواہر ریزے ہیں۔ بس ایک شعر پیش کرتا ہوں، جس میں محض ایک جلوے کی خاطر کوہِ سینا کی تقدیس کے ذکر اور اصل ذات کے ساتھ وصال کے وقت نقشِ پا کی رفعت کا موازنہ ہے:

'فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ' کا موسیٰ کو ہے طور پر ارشادِ باری
خود عرش لیے سر پر ان کی نعلینِ کفِ پا ہوتا ہے

مولانا ضیاء القادری کی زندگی نعتِ رسولِ مقبول ﷺ سے عبارت تھی۔ آپ کے برادر زادہ اور شاگرد شکیل بدایونی کہتے ہیں:

"حفیظ جالندھری کے 'شاہنامہ اسلام' سے متاثر ہو کر میں نے جشنِ میلاد میں پڑھنے کے لیے علامہ سے ایک نظم کی فرمائش کی، دوسرے ہفتے انھوں نے چار سو اشعار کا یہ مجموعہ میرے حوالے کر دیا"---

'شاہنامہ اسلام' کی زمین میں کہی گئی یہ نظم آستانہ بک ڈپو دہلی نے 'نغمۂ ربانی' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دی۔ صبحِ ولادت کے متعلق دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

چمن آرائیاں تھیں دید کے قابل زمانے کی
خوشی تھی ہادیٔ اسلام کے دنیا میں آنے کی

یہ قدرت رضاکار نظامِ خیر مقدم تھا
زمیں بوسِ حریمِ آمنہ ہر ایک عالم تھا

علامہ ضیاء القادری کی قادر الکلامی، جدتِ مضامین اور ندرتِ بیان کی کیا تعریف کی جائے؟ حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ جتنے پر گو تھے، اس کے بعد اتنے محاسنِ سخن کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا، جس قدر محاسن وہ اپنے کلام میں پرو لاتے ہیں۔ ان کا نعتیہ کلام حسنِ تغزل کا خوب صورت اظہار ہے، وہ عبادت سمجھ کر نعت کہتے ہیں۔ ندرتِ کلام اور جودتِ فکر کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں، وہ عام طور سے نئی نئی زمینوں اور خوب صورت ردیفوں اور قافیوں میں مدحِ حبیبِ کبریا ﷺ

کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کی ایک زمین میں لکھتے ہیں:

تا عرش بے حجاب بلائے گئے حضور ﷺ
پردہ تھا یہ کہ جن و بشر کو خبر نہ ہو

جگر مرادآبادی کی مشہور نعت اک رند ہے اور مدحت سلطانِ مدینہ کی زمین میں ان کی نعت ہے:

اخلاق کا خاکہ ہے، فضائل کا مرقع
قرآن ہے اک سیرتِ سلطانِ مدینہ
رگ رگ میں حیاتِ ابدی بن کے سما جا
اے ذوقِ غمِ فرقتِ سلطانِ مدینہ

کیف ٹونکی کی زمین میں محبت کے پھول کھلتے ملاحظہ کیجیے:

خود مصور نے جو صورت ہے سنواری ساری
پیکرِ حسن ہے تصویر تمھاری ساری

غالب کا تتبع دیکھیے:

اوجِ کلسِ گنبدِ خضرا کے تصدق!
ہے تاجِ سرِ عرشِ معلیٰ مرے آگے
میں ہوں درِ سلطانِ دو عالم ﷺ کا بھکاری
ہے ریگِ رواں، دولتِ دنیا مرے آگے

صنائع و بدائع کا حسن دیکھنا ہو، سرکار ﷺ کا پیار پانا ہو، محبت کی دنیا کی سیر کرنا ہو تو ضیاء القادری کی نعتیں پڑھیے:

ہو لبِ خشک و چشمِ تر کو نوید
دل میں سلطانِ بحر و بر ﷺ آیا

سلطانِ دو عالم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف اوراق کو دو دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے، تلمیحات واستعارات اور تشبیہات کے استعمال میں کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے:

تم نے شہیدِ عشق عمر (ؓ) کو بنا دیا
قاتل نظر ملاتے ہی قاتل نہیں رہا

زندگی انھوں نے ثنائے سرکار ﷺ میں گزار دی، اس پر انھیں بجا طور پر افتخار ہے۔ آخر اللہ کریم ﷺ کی سنت پر عمل کرنا، حضرت حسان بن ثابت ؓ کے نقشِ قدم پر چلنا اور دوسرے

بزرگانِ دین کی پیروی لائقِ ابتہاج وافتخار کیوں نہ ہو!

ثنائے سرکار مشغلہ ہے، یہی عمل ہے، یہی صلہ ہے
سوائے نعتِ رسول والا، ضیاؔ نہ کچھ اور ہم سے آیا

عدمِ سایۂ حضور ﷺ پر تقریباً ہر شاعر نے مضمون آفرینی کی ہے۔ ضیاء القادری کہتے ہیں:

چھپا کر رکھ لیا تھا آنکھ کی پتلی میں حوروں نے
نظر آتا کسے اے نورِ حق، سایہ ترے تن کا

تخیل وفکر پر اور الفاظ وتراکیب پر ان کی گرفت کی ایک مثال:

مصحفِ رخ میں ہیں آیاتِ رکوع و سجدہ
نقشِ محرابِ حرم ہیں خط و خالِ محبوب

ضیاء القادری کبھی مدینہ پہنچنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، کبھی اس ساعت خوش کو یاد کرتے ہیں جب وہ اس سعادت سے مشرف ہوئے تھے۔ کبھی وہ محبوبِ خدا ﷺ کے سراپائے بے مثل کا ذکر فرماتے ہیں، کبھی امت پر آقا ﷺ کے الطاف و اکرام کا۔ کبھی خداوند کریم کی اپنے محبوب ﷺ سے محبت کی بات چھیڑتے ہیں، کبھی سرکار ﷺ کی شفاعت طلب کرتے ہیں۔ کبھی انسانیت کے محسنِ اعظم ﷺ کے احسانوں کا تذکرہ ہوتا ہے، کبھی حضور ﷺ کے معجزات کا اور کبھی ان کے بے مثیل و بے نظیر وعدیل ہونے کا:

معدوم ازل ہی سے ہوئی صورتِ ثانی
کھینچا گیا جب آپ کی صورت کا مرقع

ہر مسلمان کی طرح انھیں بھی حضور ﷺ کی رحمت ہی سے بخشش کی امید ہے:

کریم! دیکھ کے رحمت نمائیاں تیری
گناہ گار کو اندیشۂ عذاب نہیں
بخشش کا بھی مژدہ ہے، شفاعت کا بھی وعدہ
اندازِ عطا اور ہے، عنوانِ کرم اور

مدینہ طیبہ میں حاضری کے لیے اپنی روح کی تڑپ کو الفاظ کا روپ دیتے ہیں:

کاش پیغامِ طلب آئے مدینہ سے کبھی
روز و شب ہے بے خودی میں، گوش بر آوازِ روح

معجزاتِ رسولِ اکرم ﷺ کا ذکر بھی نئے انداز سے پیش کرتے ہیں:

تھی مسیحائی لبوں میں ، رخ میں تھا نورِ خدا
معجزہ تھی ہر ادائے رحمۃ للعالمین ﷺ

ضیاء القادری کہتے ہیں کہ جب پرسشِ اعمال ہوگی تو میرے پاس نعت مصطفیٰ ﷺ کے پھول ہوں گے (اور ظاہر ہے کہ ان شاء اللہ العزیز وہ کافی ہوں گے)

کریں گے حشر میں جب تبصرہ اعمال پر قدسی
ضیاؔ گل ہائے نعتِ مصطفیٰ دامن سے نکلیں گے

مولانا یعقوب حسین ضیاء القادری نے بدایوں سے کراچی اور کراچی سے مکہ معظمہ تک کا منظوم سفرنامہ لکھا جو 'دیارِ نبی' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس سفرنامے کے مطالعے سے جہاں ان کی قادرالکلامی کے اعلیٰ نمونے سامنے آتے ہیں، وہاں آدمی خود اپنے آپ کو اس مقدس فضا میں محسوس کرتا ہے اور وہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ دیارِ نبی کی زیارت کراتے ہیں۔

۲۲۸ صفحات کی اس کتاب میں مختلف مقامات کی عظمتوں اور خصوصیتوں کے تذکرے ہیں، احباب اور ملاقاتیوں کا ذکر ہے، جذبات و احساسات ہیں، ذوقِ سخن کی بلندی ہے، محبت ہے اور عشق ہے۔ ڈیڑھ سو صفحوں کی ایک اور کتاب 'ستارۂ چشت' میں انھوں نے سلسلہ چشتیہ کے قریباً تمام بزرگوں کی منقبتیں لکھی ہیں، ان کے کلام میں خلفائے راشدین اور دوسرے بزرگانِ دین اور اولیاء کرام کی بے شمار منقبتیں ہیں، جو عقیدت کا اظہار بھی ہیں اور فن کے شاہ کار بھی۔ 'مرقع یادگار شہادت' واقعہ کرب و بلا کی جزئیات کے ساتھ ایک طویل نظم ہے، جس میں واقعات کی صحت کا ایک عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب 'تاریخ اولیائے حق' بھی میرے پیشِ نظر ہے، جس میں انھوں نے مختلف اولیائے کرام کا منظوم اور منثور تذکرہ کیا ہے۔

غرض علامہ ضیاء القادری کی فکرِ رسا نے محبوبِ کبریا علیہ التحیۃ والثناء اور ان کے ساتھیوں اور نام لیواؤں کا دامن تھاما اور تمام عمر اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس لحاظ سے آج بھی صحیح العقیدہ مسلمانوں اور نعت گو شاعروں کے لیے ان کا وجود مشعلِ راہ ہے:

مشعلِ راہِ ہدایت ہو نہ کیوں میرا وجود!
ہے ضیاؔ شمعِ حرم کی مرے کاشانے میں

[نور الحبیب، شمارہ رمضان ۱۳۹۷ھ / ستمبر ۱۹۷۷ء]

✿✿✿✿✿
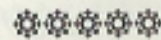
"نور الحبیب" (شمارہ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ) میں شائع شدہ مقالہ 'عظیم نعت گو' پر ایڈیٹر فاران

ماہر القادری کا تبصرہ

اس رسالہ (نور الحبیب) میں "عظیم نعت گو" کے عنوان سے مولانا ضیاء القادری پر جناب راجا رشید محمود (ایم اے) کا ایک مقالہ ہے، اس مقالہ میں مولانا ضیاء القادری کے چند بلند پایہ اشعار درج کیے گئے ہیں:

جب آپ نے 'اَنَــا بَشَــرٌ مِثْـلُـكُـمْ' کہا
انساں کو احترام کے قابل بنا دیا

وہ کملی اوڑھ کر بھی چودھویں کے چاند کہلائے
لقب قرآں میں ہے 'مُــزَّمِّــلُ وطــٰـہٰ' محمد ﷺ کا

کہتا ہے خدا بھی 'وَرَفَـعْـنَـا لَـكَ ذِكْـرَكَ'
ہو کس سے بیاں رفعتِ سلطانِ مدینہ

بخشش کا بھی مژدہ ہے شفاعت کا بھی وعدہ
انداز عطا اور ہے، عنوانِ کرم اور

کریں گے حشر میں جب تبصرہ اعمال پر قدسی
ضیا گل ہائے نعت مصطفیٰ دامن سے نکلیں گے

ان اشعار میں جو شعریت، نغمگی، خلوص اور ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے عقیدت و محبت

پائی جاتی ہے، اس کا انکار کوئی کافر ادب ہی کر سکتا ہے، مگر دو تین اشعار محلِ غور بھی نظر آئے:

'یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ' کے معنی ہم تو یہ سمجھے
ہے دستِ بے نوا دستِ حسین عرش مسکن میں

'یَد' ایک استعارہ ہے، جس کے معنی طاقت (اور ظل) کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسم سے ماورئی اور منزہ ہے، وہ ہاتھ پاؤں اور چہرہ نہیں رکھتا (سبحان اللہ عما یصفون)

اس شعر کے دوسرے مصرع سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ 'دست بے نوا یعنی دست رسول اللہ تعالیٰ کے جسمانی ہاتھ میں ہے، پھر اللہ تعالیٰ کو 'عرش مسکن' کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عرش پر (معاذ اللہ) سکونت نہیں رکھتا۔ شاعرانہ نقطہ نظر سے مصرع ثانی میں بڑا تکلف اور خاصی آورد پائی جاتی ہے۔

مقام 'لِیْ مَعَ اللّٰہِ' ہے خدائی بے خبر جس سے
جدا حدِّ خرد سے حدِّ استغراق احمد ہے

'لِیْ مَعَ اللہِ' اس قول کا صرف صوفیہ 'حدیث' کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں، حالاں کہ اس کا تذکرہ محدثین کو کرنا چاہیے تھا۔ پھر 'جدا حد خرد' کی بجائے 'حد خرد سے ماوراء' کا محل تھا۔

اس مقالہ میں بعض واقعاتی غلطیاں ہیں، جن کی تصحیح بہت ضروری ہے۔ مثلاً راقم الحروف ماہر القادری اور محشر بدایونی کو مولانا ضیاء القادری کا شاگرد لکھا ہے، مولانا ضیاء القادری کی زندگی میں ہی، میرے حالات وتاثرات رسالوں میں چھپ چکے ہیں کہ شاعری میں مجھے کسی سے تلمذ حاصل نہیں رہا۔ میں بہ حلف شرعی اعلان کرتا ہوں کہ مولانا ضیاء القادری یا کسی دوسرے شاعر کا میں شاگرد نہیں ہوں۔ محشر بدایونی صاحب سے میں نے دریافت کیا تو انھوں نے مولانا ضیاء القادری کے شاگرد ہونے کا بڑی شدت سے انکار کیا۔ محشر صاحب نے فرمایا کہ اگر میں کسی استاد کی شاگردی اختیار کرتا تو میرے پھوپھا حضرت مجتہدین عیش بدایونی اس منصب کے لیے موزوں تھے۔ حضرت عیش[1] بلند پایہ شاعر تھے اور امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

کوئی شک نہیں کہ مولانا ضیاء القادری بدایونی مرحوم بڑے پرگو، قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ایک مختصر سی نشست میں پندرہ بیس شعر کہہ دینا ان کے لیے بہت آسان بات تھی۔ مولانا مرحوم نے ہزار ہا اشعار کہے ہیں، نعت ومنقبت ان کا خاص موضوع تھا۔ پچاس ساٹھ برس پہلے ان کی غزلیں میلاد شریف کی محفلوں میں نعت خواں پڑھا کرتے تھے، ان کی نعتیہ غزل کا یہ شعر:

---

[1] میری ان کی کوئی لڑائی ہے
اب چلا جاؤں اب صفائی ہے [حضرت عیش بدایونی]

تیری مرضی ہے حقیقت میں خدا کی مرضی
ہو خدا اس کی طرف جس کی طرف تو ہو جائے

ایک بار سنتے ہی مجھے یاد ہو گیا۔

تقسیم ہند سے قبل مولانا ضیاء القادری کے شاگردوں کی تعداد قابلِ ذکر ہی نہیں ہے، قصبہ گنور ضلع بدایوں کی تحصیل میں وہ برسوں نائب رجسٹرار قانون گو اور رجسٹرار قانون گو رہے ہیں، مگر قصبہ گنور کے معروف شعراء ابر گنوری، مست گنوری اور طالب انصاری ان میں سے کوئی شاعر حضرت ضیاء القادری کا شاگرد نہیں تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بہت سے شاگردوں نے جو اپنے تخلص کے ساتھ ضیائی لکھتے ہیں، ضیاء القادری کو شاعری میں اپنا استاد مانا اور یہ حلقہ وسیع تر ہوتا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک مولانا ضیاء القادری پیری مریدی نہیں کرتے تھے، مگر کراچی آنے کے بعد وہ 'شیخ طریقت' کی حیثیت سے بیعت کرنے لگے۔

حضرت ضیاء القادری مرحوم کے مداحین ان معروف شعراء کا نام، جو ضیاء القادری کے شاگرد نہیں رہے، خواہ مخواہ رشتہ تلمذ سے جوڑ کر مولانا ضیاء القادری کی شخصیت کو فائدہ نہیں پہنچا رہے بلکہ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے۔

اس مقالہ میں اور بھی کئی باتیں خلاف واقعہ کہی گئی ہیں، مثلاً مولانا ضیاء القادری کو پاکستان کا پہلا حاجی کہا گیا (صفحہ ۱۱) 'پہلے حاجی' سے نہ جانے مقالہ نگار کی کیا مراد ہے؟ ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے مولانا ضیاء القادری کے علاوہ کیا اور کوئی مسلمان حج کرنے کے لیے نہیں گیا تھا؟ شکیل بدایونی مرحوم کو مولانا ضیاء القادری کا برادرزادہ لکھا گیا ہے، حالاں کہ شکیل کے والد مولوی محمد جمیل قادری بدایونی، مولانا ضیاء القادری کے حقیقی بھائی تو کیا دور کے رشتہ کے بھائی بھی نہ تھے، ہاں عزیز دوست تھے۔ مولانا احمد رضا بریلوی کو اس مقالہ میں مولانا ضیاء القادری کا 'روحانی پیشوا' بتایا گیا ہے، یہ بھی خلاف واقعہ ہے۔ مولانا ضیاء، حضرت مولانا عبد المقتدر بدایونی سے بیعت تھے، ان کے شیخ اور شیخ کے اسلاف مولانا ضیاء القادری بدایونی کی عقیدت کا مرکز ومرجع تھے۔ اذان ثانی کے مسئلہ پر مولانا احمد رضا خان اور علماء بدایوں میں اس قدر شدید اختلاف ہوا کہ یہ قضیہ عدالت میں پہنچا اور عدالتی چارہ جوئی اور مقدمہ بازی کی نوبت آ گئی۔ اس وقت سے علماء بدایوں اور مولانا احمد رضا بریلوی میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور مولانا احمد رضا خان کے مرنے کے بعد بھی بدایوں اور بریلی کے علماء ہم عقیدہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے ہی رہے۔ مولانا علی احمد خان اسیر، مولانا ضیاء القادری کے خالو تھے، ان کو فاضل نامہ نگار نے 'مومن وغالب کا شاگرد' لکھا ہے، جو قطعاً غلط ہے۔ اس غلطی

کی بنیاد مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی کی یہ تحریر ہے:

"خیر آباد[۱] شریف میں (مولانا علی احمد اسیر نے) مرزا غالب سے استفاضہ سخن[۲] حاصل کیا، دو غزلیں مرزا غالب کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیں، حضرت مومن دہلوی کی تشریف آوری سہسوان کی خبر بدایوں میں عام ہوئی تو آپ نے سہسوان جا کر ایک غزل حصول استفاضہ کے خیال سے حضرت مومن کے سامنے پیش کی، اس طرح آپ کا ری تلمذ ہر دو حضرات کے ساتھ قائم ہے"---

[منقبت خواجہ ولی ہند، مطبوعہ عثمانی پریس، بدایوں، جون ۱۹۳۸ء]

حالاں کہ مومن خان مومن کی وفات کے ایک سال بعد مولانا علی احمد اسیر پیدا ہوئے اور مومن جب سہسوان گئے ہیں:

چھوڑ کر دلی کو سہسوان آیا، ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

تو یہ زمانہ مولانا علی احمد اسیر کی پیدائش سے چودہ برس پہلے کا ہے، اس لیے مولانا ضیاء القادری کا یہ لکھنا کس قدر غلط اور بے سروپا ہے کہ مومن جب سہسوان تشریف لے گئے تھے تو مولانا علی احمد اسیر نے سہسوان جا کر مومن سے ایک غزل پر اصلاح لی تھی۔

سہ ماہی 'العلم' (کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۵۹ء) میں مشہور تذکرہ نگار جناب محمد ایوب قادری کا ایک مقالہ مولانا علی احمد اسیر پر شائع ہوا ہے، اس میں انھوں نے اسیر کے غالب سے تلمذ و استفادہ کی تردید کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا اسیر، امجد بدایونی کے شاگرد تھے۔ غالبیات کے مشہور محقق مالک رام (ایم اے) نے مرزا غالب کے تلامذہ کا جو تذکرہ شائع کیا ہے، اس میں غالب کے ۱۳۶ ارشاگردوں کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں، ان میں مولانا علی احمد اسیر کا نام اور ذکر نہیں ہے، حالاں کہ قاضی محمد عنایت حسین رشکی بدایونی، محمد عزیز الدین صادق بدایونی، میر ابراہیم علی خاں وفا، طالب سہسوانی اور میر عالم علی خان مایل سہسوانی کے نام اور حالات موجود ہیں۔

ماہ نامہ 'نور الحبیب' میں چوں کہ یہ مقالہ شائع ہوا ہے، اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ اس کے فاضل مدیر اس مقالہ کی غلطیوں کی تصحیح اپنے رسالہ کی کسی اشاعت میں ضرور فرمائیں گے۔ وہ پسند فرمائیں تو راقم الحروف کا پورا تبصرہ 'نور الحبیب' میں چھاپ سکتے ہیں۔

[ماہ نامہ 'فاران' کراچی، شمارہ اکتوبر ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳۵ تا ۳۸]

---

[۱]......غالب کبھی خیر آباد نہیں گئے۔

[۲]......اس میں 'حاصل کیا' زائد ہے۔ 'استفاضہ سخن کیا' یا 'استفادہ سخن کیا' لکھنا کافی تھا۔

بجوابِ ماہر

راجا رشید محمود

عظیم نعت گو علامہ ضیاء القادری کے فن پر میرے مقالے کے بارے میں جناب ماہر القادری کا پورا تبصرہ 'نور الحبیب' کے محترم قارئین نومبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، اب میری چند گزارشات حاضر ہیں:

جناب ماہر نے زیرِ نظر تبصرے میں علامہ ضیاء القادری کے بارے میں اعتراف کیا ہے کہ وہ بڑے پُرگو، قادر الکلام اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے جو اشعار راقم الحروف نے اپنے مقالے میں نقل کیے تھے، ان میں سے بیشتر کے بارے میں ماہر صاحب فرماتے ہیں، ان اشعار میں جو شعریت، نغمگی، خلوص اور ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے عقیدت و محبت پائی جاتی ہے، اس کا انکار کوئی کافرِ ادب ہی کر سکتا ہے۔

ماہر القادری کی اس رائے کے پیش نظر یہ بدگمانی تو ممکن ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ضیاء القادری کا کلام پڑھے بغیر ان کی تعریف کر دی ہوگی، مگر یہ عجب اسرار ہے کہ ضیاء القادری کے مجموعہ کلام 'تجلیاتِ نعت' یا 'گنجینۂ اوصافِ خیر الوریٰ' کے صفحہ ۸ پر زاہد القادری نے ماہر القادری اور محشر بدایونی کو

ان کے ممتاز شاگرد بتایا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن میرے پیشِ نظر ہے، جو آستانہ بک ڈپو دہلی نے جولائی ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔ ضیاء القادری اور ماہر القادری دونوں کراچی میں رہتے تھے، 'تجلیاتِ نعت' کا یہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے، پہلا ایڈیشن بہت پہلے چھپا ہوگا، آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ماہر صاحب جیسا مطالعے کا رسیا یہ کتاب نہ دیکھ سکا ہو اور اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو ان کی شاعری کے بارے میں ماہر صاحب کی رائے کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟ جو کلام پڑھے بغیر دے دی گئی۔ پھر اگر خود انھوں نے یہ کتاب نہ بھی دیکھی تھی تو بہت سے دوسرے حضرات نے پڑھی ہوگی۔ آستانہ بک ڈپو کی شائع کردہ کتاب ایسی تو نہیں ہو سکتی کہ چند نسخے چھپے ہوں اور کسی کے گھر پڑے رہ گئے ہوں، پھر ماہر القادری اور محشر بدایونی کی شاگردی کی تردید کتاب کے حوالے سے کم از کم تیس برس تک کسی نے نہیں کی، آخر اس کا سبب کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ ضیاء القادری علیہ الرحمہ کا شاگرد ہونے یا نہ ہونے کا اعلان ماہر القادری خود ہی کر سکتے ہیں لیکن یہ اعلان کتاب چھپتے ہی ہونا چاہیے تھا مگر یہ اب ہو رہا ہے، تو پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ علامہ ضیاء القادری کی زندگی میں یہ 'اعلانِ بریت' مناسب نہ سمجھا گیا ہو اور ان کی وفات کے بعد اس میں آسانی پائی گئی ہو۔ جہاں تک اس حقیقت پر تفاخر کا تعلق ہے کہ ماہر صاحب 'بے استاذ' ہیں، اس کا انھیں حق ہے لیکن ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ان کے اس 'بہ حلفِ شرعی' اعلان پر استفسار کی جسارت کرتا ہوں کہ کہیں زیادہ مدت گزر جانے کے باعث آپ بھول تو نہیں گئے کہ آپ بھی کسی کے شاگرد رہے تھے۔

جناب ماہر نے یہ بھی فرمایا ہے کہ 'تقسیم ہند سے قبل مولانا ضیاء القادری کے شاگردوں کی تعداد قابل ذکر ہی نہیں ہے۔ قصبہ گنور ضلع بدایوں کی تحصیل میں وہ برسوں نائب رجسٹرار قانون گو اور رجسٹرار قانون گو رہے ہیں مگر قصبہ گنور کے معروف شعراء ابر گنوری، مست گنوری اور طالب انصاری ان میں سے کوئی شاعر حضرت ضیاء القادری کا شاگرد نہیں تھا'۔

ماہر صاحب کے حافظے کی مدد کے لیے عرض کرتا ہوں کہ 'تجلیاتِ نعت' کے محولہ بالا ایڈیشن کے پیش لفظ ہی میں طالب انصاری کو بھی ان کا شاگرد بتایا گیا ہے اور اس کی تردید بھی آج تک کسی نے نہیں کی۔ (اور سچ کی تردید تو ایسے معاملات میں وہی کر سکتا ہے جو استادی یا ولدیت کا منکر ہو جائے۔ یا پھر ایسا جھوٹ وہی بول سکتا ہے جس کا 'عقیدہ' یہ ہو کہ 'خدا جھوٹ بول سکتا ہے'۔ جن کا خدا جھوٹ بول سکتا ہو، وہ خود کیسے جھوٹ نہ بولیں گے۔ مجھے طالب انصاری کے فرزند ارجمند محمد یونس انصاری

نے طالب صاحب کا مجموعۂ کلام 'جانِ غزل' دیا ہے جو ۱۹۷۳ء میں مکتبہ جدید پریس، لاہور میں چھپا۔ اس میں عشرت رحمانی، طالب انصاری کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"آپ لسان الحسان ضیاء القادری کے ارشد تلامذہ میں شامل ہیں۔ یہ نسبتِ تلمذ فن اور روایت کی حد تک محدود نہیں ہے"---[صفحہ ۱۵] محمود، ۲۳ر اگست ۲۰۰۶ء)

پھر قیامِ پاکستان (تقسیمِ ہند نہیں) سے پہلے شکیل بدایونی بھی ضیاء القادری کے شاگرد تھے اور صرف شکیل کا استاد ہونا ہی انھیں دنیائے ادبِ اردو میں ممتاز رکھے گا۔

مدیر فاران نے علامہ ضیاء القادری کے مداحین کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان معروف شعراء کا جو ضیاء القادری کے شاگرد نہیں رہے، خواہ مخواہ ان سے رشتۂ تلمذ جوڑ کر ان کی شخصیت کو فائدہ نہیں پہنچا رہے، بلکہ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں حضرت علامہ کا شاگرد نہیں، میں نے کبھی ان کی زیارت نہیں کی، میں نے تو صرف اس خیال سے ان کی شاعری پر خامہ فرسائی کرنے کی جسارت کی ہے کہ وہ ساری عمر میرے آقا و مولیٰ احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی مدح و ثنا کرتے رہے۔ بس اسی تعلق سے میں ان کا مداح ہوں اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، کسی معروف یا غیر معروف شاعر کا رشتۂ تلمذ خواہ مخواہ ان سے جوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں نے تو صرف اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے جو آج سے دسیوں برس پہلے شائع ہو کر دنیائے ادب میں پھیلی، پھر ذاتی طور میں استاذ شاگرد کے تعلق کو باپ بیٹے کی طرح اتنا مقدس اور اہم خیال کرتا ہوں کہ جو شخص اس رشتے سے انکار کر سکتا ہے، وہ باپ یا استاد کی شخصیت کو فائدہ پہنچا ہی نہیں سکتا۔ مگر حقیقتوں کے اظہار سے ضیاء القادری مرحوم کی شخصیت کو کس نقصان کا اندیشہ ہے، یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

ماہر القادری نے لکھا ہے کہ مولانا ضیاء القادری کے شاگرد اپنے تخلص کے ساتھ ضیائی لکھتے ہیں، اس بیان سے مغالطہ انگیزی کی بو آتی ہے، تاکہ جن شعرا کے ناموں کے ساتھ 'ضیائی' نہ ہو انھیں ان کا شاگرد نہ سمجھا جائے۔ حالاں کہ حقیقت حال یہ نہیں، کیوں کہ شکیل بدایونی، صابر براری، نسیم بستوی، طالب انصاری، مختار اجمیری، ہاشم بدایونی وغیرہ بہت سے شعرا کے نام کے ساتھ ضیائی نہیں لکھا جاتا مگر وہ مولانا کے شاگرد ہیں۔ اختر الحامدی کبھی ضیائی بھی لکھتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے شاگرد اپنے تخلص کے ساتھ مولانا سے نسبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ اصول نہیں ہے۔ بلکہ اب تو مولانا فوت ہو چکے ہیں، شاید کچھ شعرا کچھ دوسرے ساتھیوں کی تقلید میں ان کے رشتۂ تلمذ ہی سے انکار کر دیں۔

جناب ماہر نے مقالے کی کئی 'خلافِ واقعہ' باتوں کی نشان دہی کی ہے، ان میں سے ایک یہ

ہے، 'شکیل بدایونی مرحوم کو مولانا ضیاء القادری کا 'برادرزادہ' لکھا گیا ہے، حالاں کہ شکیل کے والد مولوی محمد جمیل قادری بدایونی، مولانا ضیاء القادری کے حقیقی بھائی تو کیا، دور کے رشتہ کے بھائی بھی نہ تھے، ہاں عزیز دوست تھے۔'

میں نے ماہر صاحب کی یہ عبارت کئی دفعہ پڑھی اور سوچتا رہا کہ اس کے بارے میں کیا لکھنا چاہیے۔ جب کوئی شخص آنکھیں بند کرنے کی مشق شروع کردے تو اسے سامنے پڑی ہوئی کوئی چیز دکھانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ آستانہ بک ڈپو، دہلی کی شائع کردہ کتاب 'نغمۂ ربانی' از ضیاء القادری کا پیش لفظ 'گزارش' شکیل بدایونی نے لکھا ہے، اس کی دوسری سطر میں مولانا کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''میرے بزرگ، محترم عم معظم، حضرت استاذی و ملاذی لسان الحسان مولانا ضیاء القادری قبلہ دام ظلہم الاقدس''---[نغمۂ ربانی، صفحہ ۳، طبع چہارم ۱۹۶۳ء]

مولانا ضیاء القادری کی کتاب 'مرقع یادگار شہادت' (مطبوعہ آفسٹ پریس کراچی، ۱۹۴۱ء)
۱۳۵۶ھ
کے صفحہ ۶ پر شکیل بدایونی کا قطعہ تاریخ ہے، جس پر شکیل کا نام یوں لکھا ہے:

''مولوی شکیل احمد صاحب شکیل قادری برادرزادہ مصنف''---

مولانا کے دیوان ثالث 'خزینہ بہشت' کے قطعہ تاریخ طباعت پر شکیل کا نام لکھا ہے:
۱۳۷۹ھ

''مولوی شکیل احمد صاحب شکیل بدایونی برادرزادہ حضرت قبلہ دام ظلہم العالی''---

اور قطعہ کا پہلا شعر ہے:

عموی و استاذ مولانا ضیا
عارف و عالم ادیب باصفا

اصل سفرنامہ ضیاء 'دیار نبی' مطبوعہ مکتبہ ارباب اردو، لاہور و کراچی کے صفحہ ۲۴ پر
۱۳۶۸ھ
'جانِ عزیز شکیل بدایونی' کے عنوان سے ایک نظم ہے، جس کا ایک شعر ہے:

شکیلِ نوجواں ہے لختِ دل، آرام جاں میرا
ہے گو ابنِ برادر، ہے مگر روح و رواں میرا

اسی منظوم سفرنامہ دیار حبیب کے صفحہ ۵۷ پر رضیہ سلطانہ کے ذکر کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

''رضیہ سلطانہ: برادرزادۂ مؤلف، شہیر ہند، شاعر بے عدیل، شکیل بدایونی کی بچی، جسے ہمشیر یوسف حسین قادری رئیسہ خاتون نے گود لیا ہے''---

(یوسف حسین قادری علامہ ضیاء القادری کے بیٹے تھے۔ [محمود])

علامہ ضیاء القادری کی تصنیف 'ستارۂ چشت' مطبوعہ تاج اردو گھر کراچی کے صفحہ ۲ پر شکیل بدایونی کا ایک قطعہ تاریخ ہے، اس پر بھی ان کا نام یوں لکھا گیا ہے:

''از شاعر اعظم ہند، ادیب جلیل، سخن سنج بے عدیل، حضرت شکیل صاحب بدایونی برادرزادۂ حضرت مصنف مدظلہ''---

اور قطعہ کا پہلا شعر یوں ہے:

زہے جاہ و اعزاز عم معظم
ہیں موجود جن میں صفات مشائخ

اسی کتاب کے صفحہ ۴۴ پر حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے حضور فغان درد پیش کرتے ہوئے علامہ ضیاء القادری کہتے ہیں:

مرزا شکیل جو اب ہو چکا ہے دُرِ یتیم
بنا اسے گہر شاہ وار یا خواجہ

اس شعر کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

''برادرزادہ عزیز شکیل بدایونی جو آل انڈیا شہرت کا مایہ ناز شاعر ہے.....''---

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء القادری جب شکیل کا ذکر کرتے ہیں تو اسے ''برادرزادہ' کہتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی ان کا نام لکھتے ہیں تو 'برادرزادۂ مؤلف' لکھتے ہیں۔ شکیل بدایونی جب علامہ ضیاء القادری کا نام لیتے ہیں تو انھیں 'عم معظم' کہتے ہیں۔ وہ اسے بھتیجا کہتے ہیں، وہ انھیں چچا پکارتے ہیں، دوسرے لوگ انھیں چچا بھتیجا سمجھتے ہیں، لیکن ماہر القادری کو گلہ ہے کہ راجا رشید محمود نے اپنے مقالے میں شکیل بدایونی کو ان کا 'برادرزادہ' کیوں لکھا؟

خامہ انگشت بدنداں ہے، اسے کیا لکھیے؟

اب ماہر صاحب کی 'ہمہ دانی' کے اس پہلو پر بھی غور کرلیا جائے تو کیا حرج ہے کہ 'شکیل کے والد مولانا ضیاء القادری کے حقیقی بھائی تو کیا، دور کے رشتہ کے بھائی بھی نہ تھے، ہاں عزیز دوست تھے۔'

مولانا ضیاء القادری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب 'تاریخ اولیائے حق' کے صفحہ ۱۱۳ پر یوسف حسین اور شکیل بدایونی کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اور شکیل کے رشتے کا بھی حوالہ دیا ہے، کہتے ہیں:

"علی گڑھ کے داخلے سے قبل یوسف اور شکیل دونوں کی شادی برادرم مولوی قیصر حسین قادری فریدی سلمہٗ (جو میرے پھوپھی زاد بھائی اور شکیل سلمہ کے حقیقی تایا منشی حضور احمد مرحوم کے داماد ہیں) کی لڑکیوں کے ساتھ ہوئی"---

[تاریخ اولیائے حق، مطبوعہ مشہور پریس کراچی، صفحہ ۱۴، ۱۱۳]

یعنی منشی حضور احمد، مولانا ضیاء القادری کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور شکیل بدایونی کے حقیقی تایا، اس طرح شکیل کے والد مولوی جمیل قادری، مولانا ضیاء القادری کے پھوپھی زاد ہوئے اور شکیل ان کے 'برادرزادہ' مگر ماہر صاحب اس حقیقت کے اظہار کو بھی میری 'واقعاتی غلطی' گردانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے حال پر رحم کرے۔

ماہر صاحب نے اپنے تبصرے میں ایک اور بات 'خلاف واقعہ' قرار دی ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ 'مولانا ضیاء القادری کو پاکستان کا پہلا حاجی کہا گیا ہے، پہلے حاجی سے نہ جانے مقالہ نگار کی کیا مراد ہے؟ ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے مولانا ضیاء القادری کے علاوہ کیا اور کوئی مسلمان حج کرنے کے لیے نہیں گیا تھا'؟

اب تک میں یہ سمجھتا تھا کہ ماہر صاحب کی کوئی نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ ہر بات میں کیڑے نکالنے کو اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں مگر اس اعتراض سے شک ہو رہا ہے کہ درست سمت میں چلنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ 'پاکستان کا پہلا حاجی' سے جب وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے ضیاء القادری کے سوا کوئی مسلمان حج کرنے ہی نہیں گیا تھا تو صرف حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہوتا ہے، سیدھی بات ہے کہ ان کی درخواست سب سے پہلے پہنچی اور اس سال حج کی سعادت سے بہرہ یاب ہونے والوں کی فہرست میں ان کا نام پہلا تھا۔ میرا خیال ہے پہلا حاجی سے کوئی بھی شخص اس کے علاوہ کوئی مطلب اخذ نہیں کر سکتا مگر ماہر صاحب تو بلاشبہ بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ مولانا ضیاء القادری اپنی تصنیف 'تذکرہ دوام، تاریخ اولیائے حق' میں خود لکھتے ہیں:

"یہ فقیر بارادۂ حج مبارک بعد فراغ جلسہ رجبی شریف ۱۳۶۷ھ/ ۴ رشعبان ۱۳۶۷ھ مدینۃ الاولیاء بدایوں شریف کی برکات سے محروم ہو کر ۱۴ رجون ۱۹۴۸ء کو کراچی پہنچا۔ میری درخواست حج بدایوں سے آچکی تھی۔ یہ عجب حسن اتفاق ہے کہ پاکستان کا پہلے نمبر کا حاجی یہی فقیر نامزد ہوا"---[صفحہ ۱۱۰-۱۱۱]

مدیر فاران کو علامہ ضیاء القادری کے وہ دو اشعار 'محل غور' نظر آئے ہیں، جن میں "یَدُ اللّٰہِ

فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ' اور 'لِیْ مَعَ اللّٰہِ' کی تشریح کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم ﷺ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا ہے، ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کہا ہے، انھیں مومنین کے لیے رؤف و رحیم فرمایا ہے، عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، مگر ماہر القادری اور ان کے ہم مسلک حضرات قرآن کی ان آیات کا از خود تو ذکر ہی نہیں کرتے، کہیں کوئی ذکر کر دیتا ہے تو یہ لوگ تاویل کرتے ہیں، استعاروں اور تشبیہات کی وادیوں کی سیر کراتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کفار کے ذکر میں اپنے محبوب سے کہتا ہے ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ﴾ تو اس میں ان حضرات کو کوئی استعارہ نظر نہیں آتا۔ کوئی شخص قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں عبدالنبی اور عبدالمصطفیٰ نام رکھ لے تو یہ کہتے ہیں کہ شرک ہو گیا اور قرآن کی اس ہدایت سے صرف نظر کرتے ہیں:

﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ﴾---

ہادیٔ اعظم نورِ مجسم رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ رَآنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ---[صحیح بخاری، حدیث ۷-۶۹۹۶]

"جس نے مجھے دیکھا، اس نے خدا کو دیکھ لیا"---

تو یہ لوگ یا تو اس حدیث ہی سے انکار کر دیتے ہیں یا اس میں تاویل کرنے لگتے ہیں۔

آقا ﷺ نے فرمایا:

لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ مَلَکٌ مُّقَرَّبٌ وَّ لَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ---[کشف المحجوب، مرکز تحقیقات فارسی، صفحہ ۲۳۹]

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس قول کا صرف صوفیہ حدیث کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں۔[۱]

سرکار کائنات فخر موجودات ﷺ کا ارشاد ہے:

اَیُّکُمْ مِثْلِیْ؟---"ہے کوئی تم میں سے میری مثل"؟---[صحیح بخاری، حدیث ۱۹۶۵]

تو ان حضرات کی رگِ تحریف و تاویل پھڑک اٹھتی ہے۔ چناں چہ ماہر صاحب نے بھی اپنی توحید کی حفاظت کے خیال سے مولانا ضیاء القادری کے مذکورہ بالا دو شعروں پر اعتراض کیا ہے۔ انھیں مسلک حقہ اہل سنت و جماعت پر ہمیشہ اعتراض ہوتا ہے اور اس کا ذکر وہ کہیں بھی 'سیدھی طرح' نہیں کر سکتے۔ مثلاً میں نے علامہ ضیاء القادری پر اپنا زیر بحث مقالہ لکھتے ہوئے ایسی کوئی بات نہیں کی،

---

[۱]......حالاں کہ حضرت داتا گنج بخش ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ایسے جامع علوم ظاہر و باطن ثقہ امام، شیخ، عالم اور فقیہ کا اس حدیث کو اپنی تصنیف میں نقل کر دینا ہی اس کے معتبر ہونے کی قوی دلیل ہے۔[ادارہ]

ان کے تبصرے میں بھی سیاق وسباق کے لحاظ سے اس کی کوئی گنجائش نہیں مگر وہ مولانا ضیاء القادری کے شاگردوں کا ذکر کرتے کرتے ایک دم دوسری طرف چلے جاتے ہیں:

''۱۹۴۷ء تک مولانا ضیاء القادری پیری مریدی نہیں کرتے تھے، مگر کراچی آنے کے بعد وہ 'شیخ طریقت' کی حیثیت سے بیعت کرنے لگے'' (شاید اسی جرم کی پاداش میں ان سے ماہر القادری کا رشتہ تلمذ نہیں رہا)۔۔۔

اہل سنت وجماعت کا مسلک، جسے یار لوگ 'بریلوی مسلک' بھی کہتے ہیں، وہی راہ ہے، جس کے راہی ضیاء القادری تھے، اسی لیے میں نے اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خان بریلوی قدس سرہ العزیز کو ان کا 'روحانی پیشوا' بھی کہا تھا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو ماہر القادری کا پیشوا کہہ دیا جائے۔

میرا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا کہ مولانا ضیاء القادری، اعلیٰ حضرت بریلوی سے بیعت تھے، نہ میرا یہ موضوع تھا۔ میں تو ضیاء القادری کی نعتیہ شاعری پر گفتگو کر رہا تھا اور مولانا ضیاء القادری بھی نعت میں اسی مسلک کے پیرو تھے، جس کے نام لیوا احمد رضا بریلوی تھے (رحمہما اللہ تعالیٰ) جس میں خدا کے محبوب کو اپنا 'بڑا بھائی' یا 'اپنے جیسا بشر' یا 'مر کر مٹی میں مل جانے والا' (نعوذ باللہ) کہنے والوں کی کوئی جگہ نہیں ہوتی، جس میں مشائخ طریقت بھی ہوتے ہیں اور مریدان باصفا بھی، جس میں ان پر طعن واستہزاء کی حاجت نہیں ہوتی۔

مولانا ضیاء القادری، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی کو اپنا 'روحانی پیشوا' سمجھتے تھے، ملاحظہ فرمایئے، مولانا کے ایک شاگرد رئیس صدیقی بدایونی کہتے ہیں (یہاں بھی نعت کے حوالے سے بات کی جا رہی ہے):

''یہ عاجز بدایوں میں اکثر اپنی جماعت کے ساتھ محافل میلاد شریف میں اعلیٰ حضرت رضا بریلوی اور حضرت امیر بدایونی رحمۃ اللہ علیہما کے قصائد نور کے چند اشعار برسوں پڑھتا رہا ہے۔ (راقم الحروف اور دیگر تلامذۂ حضرت قبلہ نے برادر گرامی حضرت مختار صاحب اجمیری کی تحریک پر مصرع طرح 'باغ طیبہ میں سہانا پھول پھولا نور کا' پر اشعار لکھے)...... حضرت قبلہ نے ہم لوگوں کے اشعار دیکھ کر فرمایا کہ میاں 'ہمیں تو آج تک یہ داعیہ بھی پیدا نہ ہوا کہ اپنے دو واجب التعظیم بزرگوں کے نوری قصائد کی موجودگی میں خود کچھ لکھنے کی جسارت کریں مگر آپ لوگوں کی جرأت قابل حیرت ہے''۔۔۔

[چراغ صبح جمال، مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی، صفحہ ۴]

اور جب علامہ ضیاء القادری سے بھی باصرار قصیدۂ نور لکھوایا گیا تو انھوں نے آخری شعر میں رضا اور امیر سے استفادے کا اشارہ کرتے ہوئے ان کے لیے نیک خواہشات ظاہر کی ہیں:

ہے منور نور سے قبر رضا ، قبر امیر
ان کے صدقے یہ قصیدہ بھی ہو سارا نور کا

[چراغ صبح جمال، مرتبہ رئیس صدیقی، صفحہ ۲۹]

اس کتاب کے صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۴ تک مولانا ضیاء القادری نے اعلیٰ حضرت کا، ان کے قصیدۂ نور کا، آستانہ عالیہ قادریہ کے روحانی اور کیف آفریں مناظر کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ان کے ایک ایک حرف سے رضا بریلوی سے کسب فیض کی مہک آتی ہے۔

جناب ماہر نے 'اذان ثانی' کے مسئلے پر مولانا احمد رضا خان اور علماء بدایوں میں شدید اختلاف کا ذکر چھیڑا ہے اور اس سے یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ اس فروعی اختلاف کے باعث یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ضیاء القادری، رضا بریلوی سے اکتساب فیض کریں۔

اعلیٰ حضرت اور علماء بدایوں کے علمی اختلاف کو ماہر صاحب نے جس ماہرانہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ درست نہیں۔ کیوں کہ ضیاء القادری جو حضرت عبدالمقتدر بدایونی قدس سرہ سے بیعت تھے، اعلیٰ حضرت کی مدحت میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور انھی کی راہ کے راہی ہیں۔ پھر اہل بدایوں میں بہت سے حضرات اعلیٰ حضرت بریلوی کے پیر ومرشد حضرت شاہ آل رسول قادری برکاتی مارہروی علیہ الرحمہ سے بیعت تھے۔ ان میں سے ایک حضرت شاہ عزیز بخش قادری صابری کہ 'بدایوں کے خاندان بخوش کے سربرآوردہ اور مشائخ ہند میں خصوصی عظمت رکھنے والے بزرگ تھے' کا ذکر ضیاء القادری مرحوم اپنی تصنیف 'یا رب نبی' میں بھی کرتے ہیں (صفحہ ۱۳۵)۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ حضرت محب رسول بدایونی کے مناقب، قصیدہ کی صورت میں لکھ کر حضرت مولانا فضل رسول قادری بدایونی کے عرس مبارک پر پیش کرتے ہیں (محبوب حق، لائل پور، ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء) مگر مولانا ضیاء القادری کا 'روحانی پیشوا' نہ ماننے کی کوشش میں اعلیٰ حضرت اور علماء بدایوں کے علمی فروعی اختلاف پر دشمنی کی ایک عمارت کھڑی کر دینے کا کام ماہر صاحب ہی کر سکتے ہیں۔

ماہر صاحب نے ایک بات یہ کہی ہے کہ 'مولانا علی احمد خاں امیر، مولانا ضیاء القادری کے خالو تھے، ان کو فاضل نامہ نگار (؟) نے مومن وغالب کا شاگرد لکھا ہے، جو قطعاً غلط ہے'۔ میرے مقالے میں اس رائے کی بنیاد 'تجلیات نعت' کے مصنف میری نظر میں 'ازز اہد القادری' کی یہ تحریر ہے:

''حضرت مولانا امیر کو شاعری میں مرزا غالب اور حضرت مومن سے شرف تلمذ

حاصل تھا‘‘---[تجلیاتِ نعت، صفحہ ۷]

جناب ماہر نے یہ تو کہہ دیا ہے کہ مومن کی وفات کے بعد امیر پیدا ہوئے مگر سنین کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح مومن کے سہسوان آنے کا سال بھی نہیں لکھا تاکہ بات واضح ہو جاتی۔ صرف ماہر صاحب کا لکھ دینا ہی تو کافی نہیں ہے۔ یہ حقائق کی دنیا ہے، اس میں آپ جو بات کرتے ہیں، کسی حوالے سے کیجیے۔ اسی طرح اس بات سے کہ مالک رام نے مرزا غالب کے تلامذہ میں امیر بدایونی کا نام نہیں لکھا، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ غالب کے شاگرد نہیں تھے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے دوسروں کی آنکھوں کے تنکے تلاش کرنا ماہر صاحب کی خصوصیت ہے، لیکن اگر وہ چاہیں تو ان کی تحریروں کے 'شہتیر دِن' کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے۔ زبان و بیان سے قطع نظر حضرت عیش بدایونی کا نام انھوں نے 'مجتہدین' لکھا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ نام 'مجتہد الدین' ہو۔ نیز 'ید اللہ فوق ایدیھم' کے خیال کو نظم کرنے اور 'لی مع اللہ وقت' کی حدیث پر معترض ماہر القادری کے ماہ نامہ فاران کراچی کے اسی (اکتوبر ۱۹۷۷ء کے) شمارے میں ان کی نظم 'شاہ فیصل شہید' شامل ہے، جس کا آخری شعر ہے:

وہ خلد آشیاں اور جنت مقام

علیہ سکینۃ، علیہ السلام

نبی الانبیاء محبوب خدا ﷺ کی بات ہو تو چاہے خدا نے ہی انھیں رؤف و رحیم کہا ہو، ان لوگوں کو اس میں شرک و بدعت کی علم داری نظر آنے لگتی ہے مگر خود ایک ملک کے بادشاہ کو 'علیہ السلام' کہہ دیں تو عین توحید ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بزرگ، تابعی یا تبع تابعی کو 'رضی اللہ عنہ' لکھ دے تو گردن زدنی اور یہ جسے چاہیں 'رضی اللہ عنہ' قرار دیں، عین اسلام۔

تبصرے کے آخر میں جناب مدیر فاران نے لکھا ہے کہ 'ماہ نامہ نور الحبیب میں چوں کہ یہ مقالہ شائع ہوا ہے، اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ اس کے فاضل مدیر اس مقالہ کی غلطیوں کی تصحیح اپنے رسالہ کی کسی اشاعت میں ضرور فرما دیں گے۔ وہ پسند فرمائیں تو راقم الحروف کا پورا تبصرہ نور الحبیب میں چھاپ سکتے ہیں'۔

نور الحبیب والوں نے تو آپ کا پورا تبصرہ نومبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع کر دیا ہے، اب آپ سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ میری وضاحتی گزارشات اپنے جریدے میں شائع فرما دیں تاکہ فاران کے قارئین کرام کی نگاہوں سے دوسرا پہلو اوجھل نہ رہے۔

[نور الحبیب، شمارہ محرم ۱۳۹۸ھ/جنوری ۱۹۷۸ء]

حرف و حکایت

احمد ندیم قاسمی

۲۹/دسمبر ۱۹۷۷ء

پچھلے دنوں رسالہ ’’نور الحبیب‘‘ (بصیر پور، ضلع ساہیوال) کے دو شمارے ہمارے ہاتھ لگے۔ نومبر ۱۹۷۷ء کی فہرست مندرجات میں 'فاران کا تبصرہ...... ماہر القادری' کے الفاظ پڑھتے ہی ہم صفحہ ۲۸ پر پہنچے کہ جب جناب ماہر القادری تبصرہ فرماتے ہیں تو ایسی دور دور کی کوڑیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کے لاتے ہیں کہ پڑھنے والے مدت مدید، عرصہ بعید تک بہت محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ تبصرہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ معروف نعت گو راجا رشید محمود نے 'عظیم نعت گو' کے عنوان سے مولانا ضیاء القادری مرحوم کے کمالِ فن پر ایک مضمون لکھا جو 'نور الحبیب' کے شمارہ رمضان المبارک میں درج ہوا اور جناب ماہر القادری نے اسی مضمون پر تبصرہ تحریر کیا ہے۔ بعض نکات اعتقادات سے تعلق رکھتے ہیں، جنھیں چھیڑنا ہمارا منصب نہیں ہے، ہم اس تبصرے کے صرف ادبی و علمی حصے قارئین کی نذر کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں بھی ہم خود بہت کم کہیں گے کیوں کہ 'نور الحبیب' کے بعد کے شمارے (جنوری ۱۹۷۸ء) میں راجا رشید محمود نے اپنے مضمون پر جناب ماہر القادری کے تبصرے پر تبصرہ رقم فرما دیا ہے اور یوں بعض دل چسپ حقائق سامنے آئے ہیں۔

'جوابی کارروائی' میں راجا رشید محمود لکھتے ہیں:

’’زبان و بیان کے اعتبار سے دوسروں کی آنکھ کے تنکے تلاش کرنا ماہر صاحب کی

خصوصیت ہے، لیکن اگر وہ چاہیں تو ان کی تحریروں کے 'شہتیر وں' کی نشان دہی بھی کی جاسکتی ہے'' ---

مگر سوال یہ ہے کہ وہ کیوں چاہیں گے، کوئی بھی کیوں چاہے گا۔ بہر حال یہ 'نور الحبیب' والوں کی نیک نفسی ہے کہ اپنے تبصرے کے آخر میں ماہر صاحب نے پیش کش کی کہ اگر 'نور الحبیب' کے فاضل مدیر پسند فرمائیں تو راقم الحروف کا پورا تبصرہ 'نور الحبیب' میں چھاپ سکتے ہیں اور مدیر موصوف نے 'فاران' کا یہ تبصرہ چھاپ دیا مگر اس کی پیشانی پر انتہائی قسم کے یہ الفاظ بھی درج فرمادیے کہ 'تبصرہ ہذا کا جواب راجا رشید محمود کے قلم سے آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں'۔

اب یہ آئندہ شمارہ بھی ہمارے سامنے ہے، جس میں راجا صاحب کا موعودہ جواب درج ہے، مگر راجا صاحب نے یہ غضب ڈھایا ہے کہ جس طرح کی پیش کش ماہر صاحب نے کی تھی (اور اسے قبول کرلیا گیا تھا) اسی طرح کی پیش کش راجا صاحب نے بھی یوں کردی ہے کہ ''نور الحبیب والوں نے تو آپ کا پورا تبصرہ نومبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع کردیا ہے، اب آپ سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ میری وضاحتی گزارشات اپنے جریدے میں شائع فرمادیں تاکہ فاران کے قارئین کرام کی نگاہوں سے دوسرا پہلو اوجھل نہ رہے''۔

اب دیکھیں، ماہر صاحب یہ جوابی پیش کش قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ ہم کوئی حتمی رائے اس لیے نہیں دے سکتے کہ یہ پیش کش، پیش کش کم اور پیچ کس زیادہ ہے اور ہم حیران ہیں کہ ماہر صاحب سے کیا جواب بن پڑے گا۔

ماہر القادری صاحب نے راجا رشید محمود کے مقالے میں بعض ''واقعاتی غلطیاں'' پکڑی ہیں، جن کی تصحیح ان کی نظر میں ضروری ہے۔ مثلاً مقالے میں ماہر القادری اور محشر بدایونی کو مولانا ضیاء القادری کا شاگرد لکھا ہے۔ اب ماہر صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمایئے:

''مولانا ضیاء القادری کی زندگی میں ہی میرے حالات وتاثرات رسالوں میں چھپ چکے ہیں کہ شاعری میں مجھے کسی سے تلمذ حاصل نہیں رہا۔ میں بہ حلفِ شرعی اعلان کرتا ہوں کہ مولانا ضیاء القادری یا کسی دوسرے شاعر کا میں شاگرد نہیں ہوں'' ---

اس کے بعد ماہر صاحب نے اس امر کی بھی تردید کی ہے کہ محشر بدایونی کو مولانا ضیاء القادری سے تلمذ حاصل تھا، اس کے جواب میں راجا رشید محمود نے ماہر صاحب پر واضح کیا ہے کہ مولانا ضیاء القادری مرحوم کے مجموعہ کلام 'تجلیات نعت یا گنجینۂ اوصاف خیر الوریٰ' کے صفحہ ۸ پر زاہد القادری نے ماہر صاحب اور محشر صاحب کو ان کا ممتاز شاگرد بتایا۔ آستانہ بک ڈپو دہلی نے جولائی ۱۹۵۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تھا۔ ظاہر ہے پہلا ایڈیشن بہت پہلے چھپا ہوگا۔ راجا صاحب لکھتے ہیں:

''آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ماہر صاحب جیسا مطالعے کا رسیا کتاب نہ دیکھ سکا ہو.......... آستانہ بک ڈپو کی شائع کردہ کتاب ایسی تو نہیں ہوسکتی کہ چند نسخے چھپے ہوں اور کسی کے گھر پڑے رہ گئے ہوں۔ پھر ماہر القادری اور محشر بدایونی کی شاگردی کی تردید کتاب کے حوالے سے کم از کم تیس برس تک کسی نے نہیں کی، آخر اس کا سبب کیا ہے، ظاہر ہے کہ ضیاء القادری علیہ الرحمہ کا شاگرد ہونے یا نہ ہونے کا اعلان ماہر القادری خود ہی کرسکتے ہیں، لیکن یہ اعلان کتاب چھپتے ہی ہونا چاہیے تھا مگر یہ اب ہو رہا ہے، تو پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ علامہ ضیاء القادری کی زندگی میں یہ 'اعلان بریت' مناسب نہ سمجھا گیا ہو اور ان کی وفات کے بعد اس میں آسانی پائی گئی ہو۔ جہاں تک اس حقیقت پر تفاخر کا تعلق ہے کہ ماہر صاحب 'بے استاد' ہیں، اس کا انھیں حق ہے لیکن ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ان کے اس 'بہ حلف شرعی' اعلان پر استفسار کی جسارت کرتا ہوں کہ کہیں زیادہ مدت گزر جانے کے باعث آپ بھول تو نہیں گئے کہ آپ بھی کسی کے شاگرد رہے تھے؟'' ---

یہ بہت ہی دل چسپ علمی مسائل ہیں اور امید کرنی چاہیے کہ ماہر صاحب اپنے رسالے میں راجا صاحب کا یہ جواب شائع کریں گے، پھر جواب الجواب لکھیں گے اور تب یہ نکتہ واضح ہوگا کہ جب تیس برس پہلے ایک کتاب میں اعلان ہوگیا تھا کہ ماہر صاحب نے مولانا ضیاء القادری سے اصلاح لی تھی تو اس کی تردید فوراً کیوں نہ ہوگئی اور اب راجا رشید محمود کے مقالے کی اشاعت سے 'بریت' کا یہ محل کیسے پیدا ہوگیا؟ مگر ابھی کہاں، ابھی تو مزید علمی نکات کل ملاحظہ فرمایئے گا۔

[روزنامہ امروز، ۲۹ دسمبر ۱۹۷۷ء]

۳۰/ دسمبر ۱۹۷۷ء

کل آپ نے رسالہ 'نور الحبیب' کے حوالے سے جناب ماہر القادری کی طرف سے مولانا ضیاء القادری مرحوم سے شرف تلمذ رکھنے کی تردید اور راجا رشید محمود کی طرف سے حوالوں کے ساتھ اس تردید کی تردید ملاحظہ فرمائی تھی، آج چند مزید نکات ملاحظہ کیجیے:

راجا صاحب نے مولانا ضیاء القادری کی نعت گوئی پر اپنے مقالے میں شکیل بدایونی مرحوم کو مولانا ضیاء القادری کا 'برادر زادہ' لکھا تھا۔ ماہر صاحب نے اس مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ شکیل کے والد مولانا ضیاء القادری کے حقیقی بھائی تو کیا، دور کے رشتہ کے بھائی بھی نہ تھے، ہاں عزیز دوست تھے۔

اس پر راجا رشید محمود رقم طراز ہیں:

"میں نے ماہر صاحب کی یہ عبارت کئی دفعہ پڑھی اور سوچتا رہا کہ اس کے بارے میں کیا لکھنا چاہیے۔ جب کوئی شخص آنکھیں بند کرنے کی مشق شروع کر دے تو اسے سامنے پڑی ہوئی کوئی چیز دکھانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"---

اس کے بعد راجا صاحب حوالے پر حوالہ دیتے چلے گئے ہیں، کہیں شکیل مرحوم مولانا ضیاء القادری کو 'عم معظم' لکھتے ہیں اور کہیں مولانا ضیاء القادری شکیل کو برادرزادہ۔ مولانا کی کتاب 'مرقع یادگار شہادت' (مطبوعہ ۱۹۴۱ء) میں شکیل کو 'برادرزادہ مصنف' تحریر کیا گیا ہے۔ خود مولانا مرحوم کا یہ شعر بھی بطور حوالہ پیش کیا گیا ہے:

شکیلِ نوجواں ہے لختِ دل ، آرام جاں میرا
ہے گو ابنِ برادر ، ہے مگر روح و رواں میرا

اس طرح کے متعدد حوالے دینے کے بعد راجا رشید محمود لکھتے ہیں:

"ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء القادری جب شکیل کا ذکر کرتے ہیں تو اسے 'برادرزادہ' کہتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی ان کا نام لکھتے ہیں تو 'برادرزادہ مؤلف' لکھتے ہیں۔ شکیل بدایونی جب علامہ ضیاء القادری کا نام لیتے ہیں تو انھیں 'عم معظم' کہتے ہیں۔ وہ اسے بھتیجا کہتے ہیں، وہ انھیں چچا پکارتے ہیں۔ دوسرے لوگ انھیں چچا بھتیجا سمجھتے ہیں، لیکن ماہر القادری کو گلہ ہے کہ راجا رشید محمود نے اپنے مقالے میں شکیل کو ان کا 'برادرزادہ' کیوں لکھا؟"---

جناب ماہر القادری کے اس اعتراض کے دوسرے حصے کے ساتھ راجا رشید محمود نے یہ سلوک کیا ہے:

"اب ماہر صاحب کی 'ہمہ دانی' کے اس پہلو پر بھی غور کر لیا جائے تو کیا حرج ہے کہ شکیل کے والد مولانا ضیاء القادری کے حقیقی بھائی تو کیا، دور کے رشتہ کے بھائی بھی نہ تھے، ہاں عزیز دوست تھے۔ مولانا ضیاء القادری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب 'تاریخ اولیائے حق' کے صفحہ ۱۱۳ پر یوسف حسین اور شکیل بدایونی کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اور شکیل کے رشتے کا بھی حوالہ دیا ہے، کہتے ہیں کہ علی گڑھ کے داخلے سے قبل یوسف اور شکیل دونوں کی شادی برادرم مولوی قیصر حسین قادری فریدی سلمہٗ (جو میرے پھوپھی زاد بھائی اور شکیل سلمہٗ کے حقیقی تایا منشی حضور احمد مرحوم کے داماد ہیں) کی لڑکیوں کے ساتھ ہوئی۔ یعنی منشی حضور احمد، مولانا ضیاء القادری کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور شکیل بدایونی کے حقیقی تایا۔ اس طرح شکیل کے والد مولوی جمیل قادری، مولانا ضیاء القادری کے پھوپھی زاد ہوئے اور شکیل ان کے 'برادرزادہ' مگر (ماہر) صاحب

اس حقیقت کے اظہار کو بھی میری 'واتفاقی غلطیاں' گردانتے ہیں، اللہ میرے حال پر رحم کرے"---

جناب ماہر القادری نے راجا رشید محمود کے مقالے میں ایک اور 'واتفاقی غلطی' کا بھی ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

اس مقالہ میں اور بھی کئی باتیں خلاف واقعہ کہی گئی ہیں، مثلاً مولانا ضیاء القادری کو پاکستان کا پہلا حاجی کہا گیا ہے، پہلے حاجی سے نہ جانے مقالہ نگار کی کیا مراد ہے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے مولانا ضیاء القادری کے علاوہ کیا اور کوئی مسلمان حج کرنے کے لیے نہیں گیا تھا؟

ان سطور پر راجا رشید محمود کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

"اب تک میں یہ سمجھتا تھا کہ ماہر صاحب کی کوئی نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ ہر بات میں کیڑے نکالنے کو اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں مگر اس اعتراض سے شک ہو رہا ہے کہ درست سمت میں چلنا ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ 'پاکستان کا پہلا حاجی' سے جب وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے ضیاء القادری کے سوا کوئی مسلمان حج کرنے ہی نہیں گیا تھا تو صرف حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہوتا ہے"---

راجا صاحب کا ارشاد جاری ہے:

"سیدھی بات ہے کہ ان کی درخواست سب سے پہلے پہنچی اور اس سال حج کی سعادت سے بہرہ یاب ہونے والوں کی فہرست میں ان کا نام پہلا تھا۔ میرا خیال ہے 'پہلا حاجی' سے کوئی بھی شخص اس کے علاوہ کوئی مطلب اخذ نہیں کر سکتا۔ مگر ماہر صاحب تو بلاشبہ بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ مولانا ضیاء القادری اپنی تصنیف 'تذکرۂ دوام، تاریخ اولیائے حق' میں خود لکھتے ہیں:

"یہ فقیر بارادہ حج مبارک، بعد فراغ جلسہ رجبی شریف ۱۳۶۷ھ/ ۳ر شعبان ۱۳۶۷ھ، مدینۃ الاولیاء بدایوں شریف کی برکات سے محروم ہو کر ۱۲ر جون ۱۹۴۸ء کو کراچی پہنچا۔ میری درخواست حج بدایوں سے آ چکی تھی۔ یہ عجب حسن اتفاق ہے کہ پاکستان کا پہلے نمبر کا حاجی یہی فقیر نامزد ہوا"---

مگر مزید کچھ کہنے سے پہلے ہمیں ماہر القادری کے جواب الجواب کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ بیچ ان مسائل کے!

[روزنامہ امروز، ۳۰ر دسمبر ۱۹۷۷ء]

✿✿✿✿✿
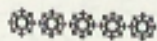
بنامِ ماہر

راجا رشید محمود

رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ کے نورالحبیب میں مولانا ضیاء القادری علیہ الرحمہ کی نعت گوئی پر میرا مقالہ 'عظیم نعت گو' چھپا تو اکتوبر ۱۹۷۷ء کے 'فاران' کراچی میں جناب ماہر القادری نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر تبصرہ فرمادیا۔ تبصرے کے آخر میں انھوں نے لکھا کہ اگر نورالحبیب کے فاضل مدیر پسند فرمائیں تو راقم الحروف کا پورا تبصرہ چھاپ سکتے ہیں۔ قارئین جانتے ہیں کہ ذوالحجہ کے نورالحبیب میں ان کا تبصرہ من وعن چھاپ دیا گیا، جس کا جواب میری طرف سے، اس کے بعد کے شمارے میں آگیا۔ میں نے اپنے مضمون کے آخر میں جوابی پیش کش کی کہ 'نورالحبیب والوں نے تو آپ کا پورا تبصرہ نومبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع کردیا ہے، اب آپ سے یہ توقع بے جانہ ہو گی کہ میری وضاحتی گزارشات اپنے جریدے میں شائع فرمادیں تا کہ فاران کے قارئین کرام کی نگاہوں سے دوسرا پہلو اوجھل نہ رہے'۔ (صحافتی دیانت کا تقاضا تھا کہ میرے ان الفاظ کے بغیر ہی یہ فرض ادا کیا جاتا) جناب احمد ندیم قاسمی نے میری اس پیش کش کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی:

''اب دیکھیں ماہر صاحب یہ جوابی پیش کش قبول کرتے ہیں یا نہیں، ہم کوئی حتمی رائے اس لیے نہیں دے سکتے کہ یہ پیش کش، پیش کش کم اور 'پیچ کس' زیادہ ہے اور ہم حیران ہیں کہ ماہر صاحب سے کیا جواب بن پڑے گا''---

[امروز لاہور، حرف وحکایت، ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۷ء]

میرا خیال یہ تھا کہ ندیم صاحب کا خدشہ درست نہیں ہوگا، ماہر صاحب خاصے 'پھنّے باز' آدمی ہیں، میرا جواب چھاپ کر کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے مگر ہوا یہ کہ ان کا میرے نام خط آ گیا:

''نورالحبیب میں آپ کا جواب دیکھا، یہ دس صفحات پر مشتمل ہے، فاران میں اسے نقل کر کے کچھ عرض کروں تو یہ مضمون بیس پچیس صفحات میں آئے گا، یعنی فاران کی نصف ضخامت میں۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ خط کے ذریعے آپ کی خدمت میں اپنا جواب مختصر پیش کروں''---

پہلی بات تو یہ ہے کہ فاران میں سوائے مخالفانہ اور معاندانہ تبصروں کے اور ہوتا کیا ہے کہ آپ نے فرار کی راہ اختیار کی ہے۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ آپ نے اس سے پہلے کبھی کسی کی وضاحت اپنے رسالے میں شائع کی ہے کہ میرا مضمون چھاپتے اور تیسری بات یہ ہے کہ جو کچھ آپ سے خط میں بن پڑا ہے، وہی میرے جواب میں لکھتے، تو آپ کو بھی پتا ہے کہ فاران کے قارئین کرام پر آپ کے بھرم کے کتنے پردے باقی رہ سکتے تھے۔

مجھے اس دوران میں کئی دوستوں نے بتایا ہے کہ ماہر صاحب کا 'طریقۂ واردات' یہی ہے کہ وہ کسی کے خلاف لکھتے ہیں، جب وہ جواب میں کچھ لکھتا ہے تو چھاپتے نہیں۔ پھر اسے خطوط میں الجھاتے ہیں اور دور دراز کار بحثیں چھیڑ دیتے ہیں۔ میں نے اسی خیال سے ان کے خط کا جواب خط کی صورت میں نہیں دیا کہ 'فاران' کو تو ہم یہ شرافت نہیں سکھا سکتے کہ وہ کسی کی پگڑی اچھالتا ہے تو جواب میں کہی گئی گزارشات کو بھی ہضم کر سکے، کم از کم نورالحبیب کے قارئین پر تو اصلیت کھل جائے۔

میں نے شکیل بدایونی کو ضیاء القادری علیہ الرحمہ کا 'برادرزادہ' لکھا تھا، ماہر صاحب نے اس کی 'تردید' کی کہ شکیل کے والد مولانا کے دور کے رشتہ کے بھائی بھی نہ تھے، ہاں عزیز دوست تھے۔ میں نے اپنے جواب میں گیارہ اقتباسات سے ثبوت دیا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی مان لیں، خط میں کہتے ہیں:

''یہ 'زادہ' والی بات لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے، جب آپ کو اس کا علم تھا کہ شکیل، مولانا ضیاء القادری کے حقیقی 'برادرزادہ' نہیں ہیں تو آپ کو 'برادرزادہ' نہیں لکھنا چاہیے تھا، ہاں یہ لکھ دیتے کہ ان کے رشتہ کے بھتیجے تھے''---

قارئین کرام! اب فرمایئے، ہر کتاب میں یہی لکھا ہے۔ شکیل انھیں عم محترم کہتے ہیں، میں نے ان کا رشتہ ثابت کردیا ہے تو ماہر صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ لکھتے کہ وہ غلطی پر تھے، انھیں علم نہیں

تھا اور انھوں نے جو لکھا تھا کہ 'شکیل کے والد مولانا کے دور کے رشتہ کے بھائی بھی نہ تھے' غلط تھا۔ مگر خدا نے انھیں یہ توفیق نہیں دی، مجھی کو مشورہ دیتے ہیں کہ جو بات شکیل وضیا اور ان دونوں کے متعلقین ساری عمر کہتے اور لکھتے تھے، وہ مجھے نہیں لکھنی چاہیے تھی، یا للعجب

پھر فرماتے ہیں کہ 'شکیل کی نسبت سے مولانا ضیاء القادری کی شخصیت کو بڑا بنانا مقصود ہے'۔ اللہ، ماہر صاحب کے حال پر رحم کرے، جو شخص بغض کے اندھیاروں کو دل میں بسا کر چلتا ہے، اسی طرح لڑکھڑاتا ہے۔ بھئی جب میں نے ثابت کر دیا اور آپ کو بھی ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ چچا، بھتیجا تھے تو اب بھتیجے اور شاگرد کی نسبت سے استاذ اور چچا کی شخصیت کو بڑا بنانے کی بات کر کے آپ صرف اپنے چھوٹے پن کا ثبوت نہیں دے رہے ہیں کیا؟

پھر آپ نے اپنے زیر نظر مکتوب میں یہ لکھا ہے کہ 'تقسیم ہند سے قبل راقم الحروف دلی میں اقامت پذیر تھا اور شکیل بھی دلی میں رہتے تھے، وہ اپنی ایک قومی نظم لے کر میرے پاس آئے، میں نے اس پر اصلاح دی'۔ ضیاء القادری تو شکیل بدایونی کے استاد تھے، آپ بھی مانتے ہیں پھر آپ 'استادی' دکھا کر اپنی شخصیت کو بڑا بنانے کی جو بھونڈی کوشش کر رہے ہیں، اسے کیا کہا جائے؟ کہیں آپ نے اپنی شخصیت کو بڑا بنانے کے زعم ہی میں تو ضیاء القادری کی شاگردی سے بریت کا اعلان نہیں کر دیا؟ بقول آپ کے 'میرے ساتھ شکیل جتنے بے تکلف تھے، اتنی ہی نیاز مندی سے ملتے تھے' نیز ضیاء القادری کے قصبہ گنور سے لے کر کراچی تک کے حالات سے آپ واقف ہیں، ان کے کلام پر ناقدانہ رائے بھی دیتے ہیں، انھیں پڑھتے بھی رہے اور اگرچہ آپ نے اپنے اس خط میں ضیاء القادری کی تحقیر کے نقطۂ نظر سے یہ لکھ دیا ہے کہ 'اگر میرے علم میں یہ بات آتی کہ مولانا ضیا کا کوئی مجموعۂ کلام چھپا ہے تو بھی میں اسے خرید کر نہ پڑھتا'۔ مگر آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پڑھے لکھے لوگوں اور پڑھنے لکھنے والے حضرات سے رابطہ رکھتے ہیں، چناں چہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تیس سال تک 'تجلیات نعت' نہ آپ کی نظر سے گزری، نہ آپ کے سیکڑوں، ہزاروں دوستوں اور 'شاگردوں' کی نظر سے۔ (شاگردوں میں نے یوں کہا ہے کہ آپ کے ملنے والوں میں جو شخص مر جائے، شکیل کی طرح اس کے متعلق یہ انکشاف فرماتے رہیے کہ وہ آپ سے اصلاح لیتا تھا) یہ نہیں ہو سکتا کہ شکیل جو آپ سے اصلاح لیتا تھا، وہ بھی آپ کو نہ بتاتا کہ 'تجلیات نعت' میں آپ کو ضیاء القادری کا شاگرد لکھا گیا ہے۔ پس قرائن سے پتا چلتا ہے کہ آپ اپنی شخصیت کو بڑا بنانے کے لیے ضیاء القادری کی شاگردی سے فی الحال منکر ہیں۔ کچھ عرصہ اور گزر گیا تو ممکن ہے کہ

مولانا ضیا کے کلام پر اصلاح دینے کا دعویٰ بھی کرنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔

میں نے اپنے مقالہ 'عظیم نعت گو' میں مولانا ضیاء القادری کو پاکستان کا پہلا حاجی کہا تھا۔ ماہر صاحب نے اعتراض کیا، میں نے وضاحت کی، تو اب فرماتے ہیں کہ 'یہ تفصیل آپ کے یا مولانا ضیاء القادری کے ذہن میں ہوگی کہ مولانا ضیاء القادری کی حج کی درخواست سب سے پہلی درخواست تھی'۔ ماہر صاحب کے 'ذہن' کی کجی ہر دفعہ بات سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے، ورنہ جب میں نے تصنیف 'تذکرۂ دوام' کے حوالے سے بات کی ہے تو آپ مولانا ضیاء القادری کے 'ذہن' کی بات کیسے کرتے ہیں۔ اور کیا یہ قصور میرا ہے کہ میں نے کچھ کتابیں پڑھ کر مقالہ تحریر کیا تھا اور یہ 'کمال' آپ کا ہے کہ آپ کچھ پڑھے بغیر حسب عادت اعتراضات کی باڑھ مارنے کی کوشش میں لگ گئے؟ 'برادر زادہ' کے مسئلے پر بھی آپ اپنی جہالت کا اعتراف نہیں کرتے اور یہاں بھی یہ نہیں کہتے کہ اگر 'تذکرۂ دوام' آپ کی نظر سے گزرتی تو آپ کو اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر آپ میرے اور مولانا ضیاء القادری کے ذہن کی بات کر کے نجانے کیوں محض اپنے آپ کو دھوکا دینے میں مصروف ہیں۔

ماہر صاحب! آپ نے اپنے خط کو طوالت دینے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کی ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ 'شکیل جب نویں دسویں کلاس میں پڑھتے تھے تو وہ شاعر کی حیثیت سے نہیں جانے جاتے تھے'۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے ان کے شاعر ہونے کا انکار ان الفاظ میں بھی نہیں کیا اور اپنے 'روحانی پیشوا' کی طرح اس امر کی گنجائش رکھی ہے کہ بعد میں اس کے کچھ اور معنی نکالے جا سکیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ دس بارہ برس کی عمر میں شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے؟ یا اب بڑھاپے میں بھی لوگ آپ کو مشاعروں میں 'کٹ پیس فروش' کہتے ہیں!

میں نے ماہر صاحب کے تبصرے کے جواب (نور الحبیب، جنوری ۱۹۷۸ء) میں کہا تھا کہ 'جناب ماہر نے یہ تو کہہ دیا ہے کہ مومن کی وفات کے بعد امیر پیدا ہوئے مگر سنین کا ذکر نہیں کیا، اسی طرح مومن کے سہسوان آنے کا سال بھی نہیں لکھا تا کہ بات واضح ہو جاتی۔ صرف ماہر صاحب کا لکھ دینا ہی تو کافی نہیں ہے، یہ تو حقائق کی دنیا ہے، اس میں آپ جو بات کرتے ہیں کسی حوالے سے کیجیے۔ اسی طرح اس بات سے کہ مالک رام نے مرزا غالب کے تلامذہ میں امیر بدایونی کا نام نہیں لکھا، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ غالب کے شاگرد نہیں تھے'۔ دہائی ہے انصاف کی کہ میری اس گزارش کے جواب میں ماہر صاحب پھر کسی سن کا حوالہ نہیں دیتے، کسی مستند کتاب کا ذکر نہیں کرتے، دوبارہ یہ لکھتے ہیں کہ 'مالک رام نے قصبہ سہسوان ضلع بدایوں اور خاص شہر بدایوں کے ان

شعراء کے نام اپنے تذکرے میں لکھے ہیں جو غالب کے شاگرد تھے اور جب مومن سہسوان گئے ہیں تو اس کے دس برس بعد امیر پیدا ہوئے'۔

حضرات! یہی بات ماہر صاحب اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں، یہی بات میرے محولہ بالا جواب کے بعد دہراتے ہیں، حقائق کی دنیا میں اگر صرف ماہر صاحب کا کہا ہوا مستند ہے اور کسی سند کی، کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے تو سر تسلیم خم ہے.................

ماہر صاحب نے اپنی یہی تکنیک استعمال کرتے ہوئے امیر بدایونی کے غالب و مومن کا شاگرد نہ ہونے کے بارے میں خط میں لکھا ہے کہ 'حیرت ہے، مولانا ضیاء القادری بدایونی نے یہ غلط اور بے سروپا بات کس طرح لکھ دی؟' یہی بات انھوں نے اپنے تبصرے میں کہی تھی، میں نے اپنے جواب میں زاہد القادری کا حوالہ دیا تھا، انھوں نے اپنے خط میں زاہد القادری کا ذکر تک نہیں چھیڑا، پھر ضیاء القادری ہی کو مطعون کیا ہے۔

'اذان ثانی' کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے تبصرے میں انھوں نے لکھا تھا کہ 'اس قدر شدید اختلاف ہوا کہ......' جب میں نے جواب میں کئی حوالوں سے بدایوں اور بریلی کے علماء اہل سنت کے آپس میں اچھے تعلقات ثابت کیے تو اب خط میں 'اذان ثانی' کے مسئلے کی شدت کو یوں نرم کر دیا گیا کہ 'بڑی کشیدگی پیدا ہو گئی......' اس کے باوجود 'میں نہ مانوں' کی رٹ اپنی جگہ ہے۔ کہتے ہیں 'میں نے مولانا ضیاء القادری کی زبان سے مولانا احمد رضا خان کی تعریف نہیں سنی'۔ آپ ہیں کیا؟ آپ نے مولانا ضیاء القادری کی دسیوں تصانیف میں سے ایک بھی نہیں دیکھی، آپ تو ان کی اور شکیل کی رشتے داری سے بھی ناواقف تھے، حتیٰ کہ آپ اپنے اور ضیاء القادری کے تعلق سے بھی بری ہو چکے ہیں۔ آپ کیا اور آپ کا سننا، نہ سننا کیا؟

جب میں نے اپنے جواب میں کتاب 'چراغ صبح جمال' مرتبہ رئیس صدیقی کے حوالوں سے ثابت کیا کہ مولانا ضیاء علیہ الرحمہ، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز کی تعریف میں رطب اللساں ہیں، تو آپ کس منہ سے مولانا ضیاء القادری سے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی تعریف نہ سننے کی بات کرتے ہیں؟ کہیں آپ کتابوں میں مرقوم حقائق کے خلاف بات کر کے اپنی شخصیت کو بڑا بنانے کی ناکام کوشش تو نہیں کر رہے؟

'چراغ صبح جمال' میں مولانا ضیاء القادری بدایوں شریف میں ایک عرس شریف پر علماء و ادباء و شعراء کا ذکر کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت کا اسم گرامی یوں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا مجدد مائۃ حاضرہ شاہ احمد رضا خان فاضل بریلوی''---[صفحہ ۷]

پھر کئی صفحات اعلیٰ حضرت کے قصیدۂ نور کی تعریف و توصیف میں لکھتے ہیں:

''حافظ عبد الحبیب قادری مرحوم محلہ بدایوں کے معزز طبقہ کے فرد تھے، انھوں نے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا مشہور قصیدۂ نورانی یعنی:

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا، آیا ہے تارا نور کا

پڑھنا شروع کیا......علماء و مشائخ، ادباء، شعراء، حاضرین محفل کیف و سرور کے عالم میں سبحان اللہ و صل علیٰ کے مودبانہ تحسین آفرین میں مشغول تھے، ایک ایک شعر چار چار پانچ پانچ بار پڑھوایا جا رہا تھا، ہر شخص پر وجد طاری تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انوار الٰہی کی بارش ہو رہی ہے۔ حافظ حبیب صاحب نے پورا قصیدہ صاحب عرس کے حضور اور مصنف قصیدہ کی موجودگی میں پڑھا......''---

[چراغ صبح جمال، مطبوعہ ۱۳۷۸ھ، صفحہ ۷، ۸]

قارئین محترم! سمجھ گئے ہوں گے کہ ماہر صاحب کو نہ صرف یہ کہ کتابوں کے مطالعے سے دشمنی ہے اور ہوائی باتوں میں یقین رکھتے ہیں، بلکہ جس شخص کو پڑھنے کی عادت ہو، اس سے بھی انھیں دشمنی ہے، چناں چہ اسی لیے وہ احقر سے الجھ پڑے ہیں کہ کتابیں پڑھ کر مضمون کیوں لکھا ہے؟ لیکن اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ماہر صاحب نے میرا جواب اپنے جریدے 'فاران' میں کیوں شائع نہیں کیا کہ اس طرح جو سو دو سو خریدار فاران کے رہ گئے ہیں، ان پر بھی ان کے 'تبحر علمی' کا راز کہیں منکشف نہ ہو جائے۔

ماہر صاحب نے اپنے 'تبصرے' میں 'مجدد الدین' کو 'مجتہدین' لکھا تھا، میں نے نشان دہی کی تو انھوں نے اپنے خط میں 'عذر گناہ' یوں تراشا ہے۔ 'فاران میں بہت سی کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں، تو کیا ان غلطیوں کو ایڈیٹر کے کھاتے میں ڈالا جائے گا'۔

حضرات گرامی قدر! آپ نے زندگی میں کبھی کسی ایڈیٹر کی زبان سے یہ جملہ نہیں سنا ہوگا۔ بھئی اگر کتابت کی غلطیاں ایڈیٹر کے کھاتے میں نہیں پڑیں گی تو اس کے ذمہ دار بھی کیا مولانا ضیاء القادری یا راجا رشید محمود ٹھہریں گے؟ ملک میں بیسیوں رسالے ایسے ہیں جن میں برائے نام غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا کریڈٹ ایڈیٹر ہی کو ہے اور جس رسالے میں کتابت کی

غلطیاں وافر ہوں (جیسا کہ خود ماہر صاحب نے اعتراف کیا ہے) تو اس کا ذمہ دار ہمیشہ ایڈیٹر ہی ٹھہرتا ہے۔ مگر 'فاران' کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

میں نے اپنے جواب میں یہ تحریر کیا تھا کہ اگر زبان و بیان کے اعتبار سے دوسروں کی آنکھوں سے تنکے تلاش کرنے والے ماہر صاحب چاہیں تو میں ان کی آنکھوں کے شہتیروں کی نشان دہی کر دوں، مگر اپنے خط میں انھوں نے اس پیش کش پر خاموشی اختیار کی ہے، نہ جانے کیوں؟

ماہر صاحب نے اپنی نظم 'شاہ فیصل شہید' میں ان کو 'علیہ السلام' کہنے کا جواز یہ بتایا ہے کہ خطوں میں بھی تو 'سلام علیکم' یا 'سلام و تحیہ' لکھا جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو، اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو توحید کے یہ داعی 'رسول السلام' اور 'سیدی' کہہ سکتے ہیں تو شاہ فیصل کو تو جو کچھ لکھ دیں، وہ کم ہے۔ بس ان کا 'اسلام' تو اس وقت خطرے میں آتا ہے، جب محبوب کبریا ﷺ کی تعریف و تعظیم کی جائے۔

ماہر صاحب کو مولانا ضیاء القادری علیہ الرحمہ کے حوالے سے تو کوئی بات کہنے کو نہیں ملی، اس لیے انھوں نے اپنے خط میں ملک کے سواد اعظم کے عقائد کو جو صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین سے چلے آ رہے ہیں، حسب سابق مشرکانہ کہا ہے۔ توحید کی حفاظت کے نام پر ان عقائد کے خلاف سب سے پہلے اسماعیل دہلوی صاحب نے آواز بلند کی اور حضور فخر موجودات ﷺ کو 'اپنے جیسا بشر' اور 'مر کر مٹی میں مل جانے والا' (نعوذ باللہ) کہا تھا۔

ماہر صاحب نے کہا ہے 'حضور کی بشریت کو مشتبہ بنانے کے لیے آپ حضرات طرح طرح کے شوشے چھوڑتے ہیں'۔ 'مولانا احمد رضا خان نے وہابیوں کی ضد میں عبد المصطفیٰ اپنا نام رکھا، جو کسی توحید شناس کو زیب نہیں دیتا'۔ 'مشرکانہ عقائد اور بدعات کو دین سمجھنا کس قدر بے توفیقی کی بات ہے؟'۔ 'حضور ﷺ کے رتبہ کو بڑھانا یہ ہے کہ حضور سے الوہی صفات منسوب کر دی جائیں؟'۔

اس بات سے قطع نظر کہ حضور ﷺ کے رتبے کو بڑھانے کا یہ جرم (نعوذ باللہ) خود خداوند کریم و عظیم نے کیا ہے کہ وہ خود بھی رؤف و رحیم ہے اور اس نے اپنے محبوب ﷺ کو بھی رؤف و رحیم کہا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب ماہر القادری صاحب میرے دونوں جوابی مضامین 'مجلہ فاران' میں چھاپ کر ان کا جواب رسالے کے ذریعے دیں گے تو میں 'مشرکانہ عقائد اور بدعات' والی ان کی ہانگی کی قلعی بھی کھول دوں گا۔ ان شاء اللہ العزیز

[نور الحبیب، شمارہ جمادی الاولیٰ، ۱۳۹۸ھ/ مئی ۱۹۷۸ء]

❁❁❁❁❁
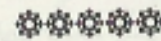
اختتامیہ

راجا رشید محمود

مولانا غلام رسول سعیدی کی کتاب 'ضیائے کنز الایمان' کے پہلے چار ایڈیشن ۱۹۷۶ء سے مئی ۱۹۷۸ء تک چھپے۔ پانچویں ایڈیشن (ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ/ اکتوبر ۱۹۷۹ء) میں محقق عصر حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر اس کا پیش لفظ راجا رشید محمود نے لکھا۔

یہ تحریر زیر نظر قضیے کے 'اختتامیہ' کے طور پر نذر قارئین ہے:

ادیب شہیر ملک شیر محمد خان اعوان نے قرآن مجید کے اردو تراجم کے ایک اجمالی تقابلی جائزے میں بعض مترجمین کی 'قرآن فہمی' کا پول کھولا اور موجودہ صدی کے مجدد، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ترجمہ قرآن کے محاسن پر گفتگو کی۔ محاسن کنز الایمان کا مقدمہ علامہ غلام رسول سعیدی نے سپرد قلم کیا تھا۔

ماہر القادری صاحب نے اپنے ماہ نامہ 'فاران' میں اس کتاب پر تبصرہ کیا، ان صاحب کی ۹۰ فی صد تحریریں کتابوں پر تبصروں کی صورت میں ہیں۔ یہی ان کا تخصص ہے، یہی ان کا ادب ہے اور یہی 'انتقاد'۔ مشہور ہے کہ یہ کسی بھی کتاب یا مقالے میں زبان و بیان کی 'غلطیوں' پر ضرور گرفت کرتے ہیں اور ان کے تبصروں سے کسی مصنف کے قلم کی عصمت محفوظ نہیں رہی۔ حتیٰ کہ اپنے ممدوح، اپنے 'پیر استاذ' جناب ابوالاعلیٰ مودودی کی اردو پر بھی انھوں نے تنقید فرمادی۔ یہ الگ بات ہے کہ مودودی صاحب نے ان کا منہ بند کرنے کے لیے اپنی سسرالی زبان کی عفت کا واسطہ دیا اور یہ جواب میں منقار زیر پر ہو گئے۔ مودودی صاحب نے انھیں لکھا:

''تہمت کو تہمد لکھنا ایک تکلف ہے اور اسے تہہ بند سے ماخوذ سمجھنا اور بھی مہمل ہے...... میری ددھیال، ننھیال اور سسرال سب دلی کی ہے، میرے رشتہ داروں تک میں کوئی دیہاتی، قصباتی نہیں ہے...... آپ میرے حوالے سے اپنی لغت کی کتاب میں نوٹ کر لیجیے کہ اس لفظ کا املا تہمت بہ 'تا' ہے''---

[مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، جلد اوّل، مرتبہ عاصم نعمانی، صفحہ ۱۹۱، ۱۹۲]

برصغیر کے مشہور نعت گو، لسان الحسان علامہ ضیاء القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فن پر میرا ایک مقالہ چھپا تو اس پر ماہر صاحب نے فاران میں تبصرہ جڑ دیا لیکن انھوں نے میری زبان پر تنقید نہیں کی (شاید اس لیے کہ میں بھی ان کی طرح 'غلطیوں سے پاک' اردو لکھتا ہوں) البتہ میں نے اس تبصرے کے جواب میں کہا:

''زبان و بیان کے اعتبار سے دوسروں کی آنکھ کے تنکے تلاش کرنا ماہر صاحب کی خصوصیت ہے، لیکن اگر وہ چاہیں تو ان کی تحریروں کے 'شہتیر وں' کی نشان دہی بھی کی جاسکتی ہے''--- [مجلہ نور الحبیب بصیر پور، جنوری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۳۰]

میری اس تحدی کے جواب میں انھوں نے جو خط مجھے لکھا، اس میں بھی اس پہلو سے پوری طرح صرف نظر کیا۔

میں نے تو صرف چیلنج دینے پر ہی اکتفا کیا تھا، میرے دوسرے مضمون 'بنام ماہر' [نور الحبیب، اپریل ۱۹۷۸ء] کے جواب میں وہ کوئی خط بھی نہ لکھ سکے، فوت ہو گئے۔ لیکن علامہ غلام رسول سعیدی

نے 'ضیائے کنز الایمان' کے ابتدائی صفحات میں ان کی زبان کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا ہے۔

قارئین کرام، علامہ سعیدی کے زیر نظر مقالے کے مطالعے سے ماہر صاحب کی دین کے بارے میں سطحی معلومات کے علاوہ ان کی نام نہاد 'زبان دانی' سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے۔ میں ماہ نامہ فاران کے 'ماہر القادری نمبر' کے حوالے سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن صاحب کے مبلغ علم کی جھلکیاں آپ زیر نظر کتاب میں دیکھیں گے، ان کے بارے میں دعوے کتنے بلند بانگ ہیں:

''تبصرے بڑے بے لاگ اور عرق ریزی کے ساتھ کیے جاتے تھے، خوبیاں اور خامیاں دونوں ایک ترتیب کے ساتھ جمع کی جاتیں، صحت مند تنقید کی روایات کو زندہ کیا جاتا''---[صفحہ ۲۶۵] ('صحت مند تنقید' کے دعوے کا بھی جواب نہیں)

''مولانا مودودی نے بھی تحقیق الفاظ کے میدان میں ماہر صاحب کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور ماہر صاحب بھی خم ٹھونک کر لڑے ہیں''---[صفحہ ۲۹]

مودودی نے تو اپنی ددھیال، ننھیال اور سسرال کے حوالے سے انھیں ناکوں چنے چبوا دیے، ماہر صاحب کس طرح خم ٹھونک کر لڑے ہیں؟؟ اسی ماہر القادری نمبر میں اسعد گیلانی کی زبان سے سنیے:

''مجھے بار بار کہتے کہ میں مولانا کو لکھ چکا ہوں، وہ میری بات نہیں مانتے، اس لیے تم لکھو...... تمہاری بات مان لیں گے، میری بات پر وہ غور نہیں کرتے''---[صفحہ ۳۵]

پتا نہیں کس محاورے میں اس طرز عمل کو خم ٹھونک کر لڑنا کہتے ہیں۔ دوسروں کے لیے تو ان کا انداز ایسے معاملات میں جارحانہ ہوتا تھا---[صفحہ ۳۵۷]

مگر جن کے وہ عقیدت مند تھے، ان کے معاملے میں یا تو سسرالی زبان کو سند مان لیتے تھے یا سرے سے ان پر تنقید کا حوصلہ ہی نہیں پاتے تھے:

''ایک صاحب بول اٹھے کہ مولانا شبلی شانِ نزول کو مذکر لکھتے ہیں، شان تو مونث ہے، شانِ نزول بھی مونث ہونا چاہیے۔ پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا، بولے کہ مولانا شبلی نے مذکر لکھا ہے تو یہی صحیح ہے...... وہ مولانا شبلی کے بڑے عقیدت مند تھے''---[صفحہ ۲۶۷]

ماہر القادری صاحب کا عقیدہ اہل سنت و جماعت کی مخالفت ہے، جو ان کے ایک ایک فقرے سے ظاہر ہے۔ وہ خود کیا ہیں؟ یہ تو ابھی تک طے ہی نہیں ہو سکا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری

انھیں 'جماعت اسلامی سے بہت قریب، سلفی عقائد سے ہم آہنگ' قرار دیتے ہیں۔[صفحہ۳۳۰]
اور وارث سرہندی کے نزدیک وہ 'دیوبندی مکتب فکر کی طرف مائل تھے'۔[صفحہ۳۶۴]

مودودی صاحب اور اپنے دوسرے ممدوحین کے سامنے بھیگی بلی نظر آنے والے ماہر صاحب کے مزاج کی کیفیات ملاحظہ ہوں:

''میں نے ایک دفعہ کہہ دیا، فارسی میں تشدید نہیں ہوتی......بس مولانا الجھ پڑے، کسی طرح یہ ماننے پر تیار نہیں ہوئے کہ فارسی میں تشدید نہیں ہوتی'' ---[تابش دہلوی، صفحہ۴۹]

''وہ میری کسی بات سے قائل ہونا پسند نہیں کرتے تھے، جب بحث کرتے میں ان کو پسینہ آنے لگتا...... ایسے ہی ایک موقع پر جب ان کی بحث میں بہت تیزی آرہی تھی..........'' ---[صباح الدین عبدالرحمٰن، صفحہ۲۷۷]

ماہر صاحب سریع الاحساس تھے اور مزاج میں کسی قدر تیزی تھی'' ---
[وارث سرہندی، صفحہ۳۵۰]

''جماعت اسلامی اور اس کے بانی کے خلاف وہ کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے'' ---[صفحہ۳۵۰]

بس ان میں اور ہم میں یہی فرق ہے کہ ہم مختار کائنات سرور موجودات ﷺ کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے۔

''مولانا اپنے خیالات میں اتنے زیادہ پختہ ہو گئے کہ آسانی سے رائے بدلنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ بعض اوقات غیر متوقع طور پر مشتعل ہو جاتے تھے'' ---[مہدی علی صدیقی، صفحہ۴۴]

یہ ان کے ہم مسلک لوگوں اور ساتھیوں کی متاط آراء ہیں۔ ایسے میں عبدالقدوس ہاشمی کا یہ دعویٰ ان کی 'صداقت مآبی' کا شاہکار دکھائی دیتا ہے۔

''اگر کبھی انھیں کسی غلطی پر ٹوکا گیا تو انھیں اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی'' ---[صفحہ۲۵۸]

آپ قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں محبوب خدا ﷺ کی تعریف کیجیے تو ماہر صاحب اور ان کے ہم عقیدہ لوگ چراغ پا ہو جاتے ہیں، لیکن خود ماہر صاحب کے بارے میں غلو نے کیا کیا

شعبدے دکھائے؟ ملاحظہ فرمایئے:

''مولانا ماہر القادری کو دیکھ کر اور ان سے مل کر میرا وجدان گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ شخص جنتی ہے۔ اگر دنیا میں کسی جنتی کو دیکھنا ہو تو ان کو اس کی علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا تھا'' ---[صفحہ۱۸۲]

''ماہر کشف وکرامات، پیری مریدی، صحبت صوفیہ کے زیادہ دل دادہ نہ تھے مگر وہ خود ایک طریقے سے 'ولی اللہ' تھے، جس کی ان کو بھی خبر نہ تھی'' ---[صفحہ۱۹۹]

''انھیں دیکھ کر حسان بن ثابت اور عبداللہ بن رواحہ یاد آتے تھے'' ---[صفحہ۲۲۶]

''وہ خوش فکر، خوش گو، خوش ذوق، خوش خو، خوش رو، خوش قامت، خوش پوش اور خوش طبع......'' ---[صفحہ۳۳۵]

پوری علمی لغت نقل کر دی گئی ہے۔

ماہر القادری نمبر میں بار بار کہا گیا ہے:

''شاعری میں انھیں کسی سے تلمذ نہیں تھا'' ---[صفحات ۵۳،۵۶،۲۱۱،۳۲۸،۳۵۱]

میں نے علامہ ضیاء القادری کی نعت گوئی پر اپنے مقالے 'عظیم نعت گو' میں زاہد القادری کے حوالے سے [تجلیات نعت، آستانہ بک ڈپو دہلی، دوسرا ایڈیشن، جولائی ۱۹۵۵ء، صفحہ۸] ماہر صاحب کو ان کا شاگرد بتایا، اس پر ماہر صاحب نے اپنے تبصرے میں اس شاگردی سے انکار کیا۔ پھر میں نے بجواب ماہر [نور الحبیب، جنوری ۱۹۷۸ء] میں دلائل دیے تو ماہر صاحب نے اپنے مکتوب میں موضوع ہی بدل دیا، البتہ ۱۳ رمئی ۱۹۷۹ء کو کراچی میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنی اقامت گاہ پر خواجہ رضی حیدر (روزنامہ حریت) اور مولانا عبدالمنعم ہزاروی (ماہ نامہ ترجمان اہل سنت) کی موجودگی میں مجھے بتایا کہ ماہر القادری نے خود انھیں ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ اپنا مجموعہ کلام اصلاح کے لیے علامہ ضیاء القادری کو دے چکے ہیں۔ ایوب قادری صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ماہر صاحب علامہ کے شاگرد نہ ہوتے تو اس انداز میں اصلاح کے لیے مسودہ ان کے حوالے نہ کرتے۔

ایک بات ماہر القادری نمبر کے مطالعے سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضور رسول انام ﷺ کی توہین وتضحیک کن لوگوں کا شعار ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی قاسم نانوتوی صاحب کو

محمد انوار الحسن شیرکوٹی کی تصنیف انوار قاسمی میں حضور ﷺ کا ثانی کہا گیا۔

''اٹھا دنیا سے جیسے بانی اسلام کا ثانی''---[صفحہ ۲۵۴]

قاسم نانوتوی صاحب کی وفات پر فضل الرحمٰن کے قطعے میں ہے:

''وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے''---[صفحہ ۲۵۴]

قاسم نانوتوی صاحب کو خدا جو دیتا تھا، وہ ساتھیوں کو دے دیتے تھے، ساتھیوں نے کہا کہ اپنے پاس بھی کچھ رکھیے تو بے ساختہ یہ حدیث پڑھی:

انما انا قاسم و اللہ یعطی---''میں قاسم ہوں، اللہ دیتا ہے''---[صفحہ ۲۵۴]

مقام عبرت ہے کہ حضور ﷺ کے قاسم ہونے کے ضمن میں یہ لوگ اس کو حدیث ہی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں یا اس کی تاویلیں کرنے لگتے ہیں لیکن دیدہ دلیری کی انتہا ہے کہ اپنے آپ کو اس حدیث کا مصداق قرار دینے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔

پروفیسر غفور احمد سیاسی وجوہ کی بنا پر کسی مزار پر چادر چڑھانے کے مرتکب ہو گئے۔[صفحہ ۲۸

ماہر القادری صاحب نے محاسن کنز الایمان پر تبصرہ کرتے ہوئے یوم میلاد منانے کو بدعت قرار دیا۔ علامہ سعیدی مدظلہ نے صفحہ ۱۹ پر اس کا جواب دیا ہے، لیکن میں ذرا ماہر القادری نمبر کا مطالعہ کرتا ہوں:

''میلاد کی محفلوں میں ماہر بھی حصہ لیتے''---[صفحہ ۱۵۳]

''محافل میلاد میں بھی ان کی بڑی مانگ ہونے لگی''---[نواب مشتاق احمد، صفحہ ۱۵۷]

ماہر صاحب کی نعتیہ نظم 'ظہور قدسی' کے تعارف میں مناظر احسن گیلانی نے لکھا:

''مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ماہر القادری کے اس سلام کے بعد میلادی سلاموں کی تاثیر و افادیت میں بڑا انقلاب پیدا ہوگا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ آئندہ اسی سلام کو میلاد کی مجلسوں میں پڑھنے پڑھانے کا دستور جاری کریں''---[صفحہ ۲۸۱]

اس سے یہ سمجھنا بھی درست نہیں کہ جب ماہر صاحب حضرت مولانا عبدالقدیر بدایونی علیہ الرحمہ کے مرید تھے، میلاد کی محفلوں میں شریک ہوتے ہوں گے، بعد میں نہیں۔ اصل صورت یہ ہے کہ ان کا رسالہ فاران تو چند سو کی تعداد میں چھپ کر مفت تقسیم ہو جاتا تھا، اس کے علاوہ ان کا کوئی

کاروبار نہیں تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنا مکان بھی بنوا لیا تھا[صفحہ ۳۵۷] لیکن غیبی امداد کے علاوہ وہ مشاعروں اور محفلوں میں نظمیں پڑھ کر کماتے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر نعت صرف کمائی کے ذریعے کے طور پر لکھی ہے اور بیش تر عید میلاد النبی ﷺ کے مشاعروں میں پڑھی ہے اور اس مقصد کے لیے 'یافت' کی امید پر وہ اپنے عقائد کو پس پشت ڈال دیا کرتے تھے۔ مثلاً:

''میں نے انھیں خالق دینا ہال میں منعقدہ یوم خواجہ معین الدین چشتی کی سالانہ تقریبات میں بھی اکثر مدعو کیا۔ حالاں کہ وہ عرس وغیرہ کے انعقاد کے سخت مخالف تھے مگر حضرت خواجہ چشتی کے عرس کی تقریبات میں پابندی سے شرکت فرماتے تھے''---[احمد رئیس، صفحہ ۳۸۳]

انھوں نے جنت المعلیٰ پر سعودی دست برد کے اثرات دیکھ کر سخت دکھ کا اظہار بھی کیا پھر اپنے خیالات سے رجوع بھی نہیں کیا اور بوجوہ قبوں کو ڈھانے کے بھی قائل رہے:

''ماہر صاحب رقم طراز ہیں کہ جنت المعلیٰ کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ اس میں صحابہ کرام، تابعین عظام اور اکابر اولیاء آسودہ ہیں۔ حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی قبر چھوڑ کر ہر طرف جھاڑ جھنکار، اونٹوں اور دنبوں کی مینگنیاں اور گندگی نظر آتی ہے یہ تو ان نفوس قدسیہ کی قبریں ہیں جو ہم سب کے مخدوم اور محسن ہیں۔ عام مسلمانوں کی قبروں کے ساتھ بھی یہ سلوک جائز نہیں، میرے دو شعر ان ہی تاثرات کی یادگار ہیں:

فغاں کروں کہ شکایت ، فسوں کہ اشک بہاؤں
کھڑا ہوا ہوں میں ٹوٹے ہوئے مزاروں پہ
تجلیاں تو چھپانے سے چھپ نہیں سکتیں
ہزار خاک اڑائے کوئی ستاروں پہ

جب وہ تصوف اور قبر پرستی کے خلاف اپنے دوستوں سے بحث کرتے تو ان کو ان اشعار کا حوالہ دیا جاتا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے جز بز ضرور ہو جاتے مگر پھر اپنی طلاقت لسانی سے اپنے معترضین کو خاموش کر دیتے''---[صفحہ ۲۸۲]

خداوند کریم نے بزرگان دین کی قبروں کو ڈھانے کے اس مبلغ کے مذکورہ بالا کردار پر، اس

کے متعلق یہ فیصلہ فرمادیا کہ اس شخص کو وہاں دفن کیا جائے جہاں چند دنوں کے بعد کوئی یہ نہ بتا سکے کہ اس کی قبر کہاں ہے۔ محمد افضل چیمہ نے ماہر صاحب کی وفات پر یہ تبصرہ کیا ہے:

''ارض مقدس میں ہی انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا:

پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا [صفحہ ۱۳]

اسعد گیلانی نے بھی یہی کہا ہے:

''بالآخر انتقال کے وقت ایسی جگہ کی خاک زور کرتی ہے، جس جگہ کی خاک اس کے خمیر میں زاید گی ہوتی ہے''---[صفحہ ۳۳]

مگر حضرات مکرم! اگر آپ انتقال کے وقت والے اس کلیے کا اطلاق ان حضرات کے ممدوح ابوالاعلیٰ مودودی کی امریکہ میں وفات پر کریں تو آپ یقیناً معتوب و مغضوب ہو جائیں گے۔

['ضیائے کنز الایمان' از مولانا غلام رسول سعیدی،

مرکزی مجلس رضا، لاہور، بار پنجم، ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ، صفحہ ۳ تا ۱۰]

❁❁❁❁❁